# کیا ہم علیحدہ ہو سکتے ہیں؟

## پاکستان میں قومی سوال کے تناظر میں مارکسی لیننی فکر کا تخلیقی اطلاق

تقسیم کے نتیجہ میں زرعی پیداوار کیلئے پانی ایک کے پاس ہوگا اور زرخیز مٹی دوسرے ملک میں، صنعت میں توانائی اور ایندھن ایک طرف ہوگا، خام مال دوسری طرف اور محنت تیسری جانب، تجارت میں کھپت ایک طرف، پیداوار دوسری طرف اور راستہ تیسرے کے قبضہ میں، نتیجتاً سب بے حال ہوں گے سب کو بے حال کرنے کی آزادی کسی کو نہیں دی جاسکتی۔

منجانب: پاکستان اسٹڈی فورم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | کیا ہم علیحدہ ہو سکتے ہیں؟ |
| ترتیب و تدوین | : | محمد سلیم شیخ |
| سن اشاعت | : | 2017ء |
| اہتمام | : | ایم رفیق |
| ناشر | : | روشن پبلی کیشنز، فیصل آباد |
| ٹائٹل | : | محمد عرفان چوہدری |
| تزئین و آرائش | : | عبدالحفیظ |
| قیمت | : | -/300 روپے |



برائے رابطہ:

**پاکستان اسٹڈی فورم**

**محمد عرفان چوہدری**

ہاؤس نمبر 129، سٹریٹ نمبر 2، کوٹ خان محمد ستیانہ روڈ فیصل آباد

0346-7709088



**روشن پبلی کیشنز**

پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹر

آفس نمبر 8، سیکنڈ فلور، تاج پلازہ، کوتوالی روڈ، فیصل آباد

0333-6597998, 0306-4463028

# انتساب

وادیٔ سندھ (مہرگڑھ، ہڑپہ، موہنجوداڑو)
کے دھرتی واسیوں کے نام

کئی گوتم آئے
اور بھگت کبیر
کتنے نانک گزرے
اور میاں میر
کئی کلمے پڑھے
بدلے کتنے دین

---------

عیسیٰ کے گھر لی پناہ
پر بن کے رہے کپوت
ہم شودر، دلت، ہریجن
ہم مصلی، کھٹانے، بھیل
یہ دنیا جھوٹ تماشا
ہم سچ کا کھلیں کھیل
آسمان شریک ہمارا
اور سوکن ہے زمین
خالی پن میں رہے معلق
ہم کمی یار کمین

(طارق گوجر)

# فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| ○ غرض وغایت | محمد سلیم شیخ | ۷ |
| ○ قومی مسئلہ | عبدالرشید دھولکہ | ۱۱ |
| ○ قومی سوال | پاکستان مزدور کسان پارٹی دستاویز | ۲۸ |
| ○ انسان کی خوش فہمی | عبدالستار | ۳۹ |
| ○ دلت اور قومی سوال | گنپت رائے بھیل | ۵۸ |
| ○ سندھ: تصوف، قوم پرستی اور سوشلزم کی تکون | شاداب مرتضیٰ | ۶۹ |
| ○ شناخت کی سیاست | محمد عرفان چوہدری | ۷۷ |
| ○ پاکستان میں قومی سوال | محمد عرفان چوہدری | ۸۴ |
| ○ طبقاتی مسئلہ | عبدالرشید دھولکہ | ۱۰۵ |
| ○ پاکستان میں قومی تشخص کا بحران | ڈاکٹر مقبول اختر | ۱۲۵ |
| ○ نیا پاکستان | میجر اسحاق محمد | ۱۵۰ |

# غرض وغایت

کیا ہم علیحدہ ہو سکتے ہیں؟ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں موجود ہے اس کے چھاپنے کی غرض وغایت بیان کرنا بہت ضروری ہے تاکہ عام قاری کو ان مجموعہ مضامین کو پڑھتے وقت مضامین کے سیاق وسباق سے آگہی رہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین مختلف لکھاریوں کی طرف سے مختلف لکھاریوں کی طرف سے مختلف اوقات اور مقامات سے لکھے گئے ہیں۔ تمام مضامین پاکستان میں قومیتی مسئلے کی تشریح اور پیچیدگیوں کا احاطہ کرتے ہوئے قومی مسئلے کے حل کیلئے مارکسی لیننی فکر کی روشنی میں ایک پائیدار اور متنوع حل کے خواہاں ہیں۔

قومی سوال پر پاکستان کے اندر مختلف طبقات کی طرف سے مختلف بیانیے اور نظریاتی تھیوریاں سرگرم رہی ہیں۔ پاکستان کی مذہبی تشکیل اور حکمران طبقات کے ریاستی بیانیے نے یہاں ایک طرف ہمارے خطے کی تہذیب وتمدن اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اس ریاستی بیانیے کے رد میں ابھرنے والی قوم پرستیوں نے بھی اس تاریخ اور تہذیب وتمدن کو اپنی خواہشات اور اپنے من پسند نتائج کے حصول کے لئے مسخ

کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ہمارے خطے کے ان حکمران گروہوں یا پرتوں کی آپسی لڑائی نے ہماری دھرتی ماں کی حقیقی مشترکہ تاریخ، تہذیب وثقافت اور محنت کش طبقے کی ابھرتی ہوئی نئی قومی تشکیل کو تقسیم اور مسخ کرنے کی کوشش کی۔

ایک طرف ریاستی بیانیہ ہمیں ہندوستان کا عکس بنا کر پیش کرتا ہے اور ہمارے خطے کی تاریخ کو ۷۱۲ سے شروع کرنے پر بضد ہے تو دوسری طرف مختلف قوم پرست حلقوں کا پیش کردہ بیانیہ مختلف وجوہات، ملکی وغیر ملکی مفادات کے تابع ہماری مشترکہ تاریخ اور تہذیب وثقافت کو توڑ مڑور کر پیش کرتا ہے۔اگر آپ پاکستان میں پنجابی، سندھی، سرائیکی، بلوچ اور پشتون قوم پرست حلقوں کے بیانیے کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح تمام اپنی من پسند نتائج کے حصول کیلئے تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور اپنی قومی تشکیل کی ابتدا اپنے من پسند وقت ومقام سے کرنا چاہتے ہیں۔مثال کے طور پر پنجابی قوم پرست حلقے ہڑپہ کے وارث بننے کی کوشش کرتے ہیں اور موہنجوداڑو اور مہر گڑھ سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔اسی طرح سندھی قوم پرست حلقے موہنجوداڑو کے وارث اور ہڑپہ، مہر گڑھ سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی حال پشتون، بلوچ اور سرائیکی قوم پرستوں کا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مہر گڑھ، امری نال، ہڑپہ، موہنجوداڑو، کوٹ ڈیجی، چولستان اور تھر کے ان تاریخی مقامات کا ایکدوسرے سے لاتعلقی پر مبنی بیانیہ ان سب کو بے معنی بنا دیتا ہے۔

پاکستان کی قومی تشکیل کے ریاستی بیانیہ اور قوم پرست حلقوں کے بیانیے کی ایک قدر جو مشترک ہے وہ ہے ان کے قومی ہیروز کا طبقاتی پس منظر۔ دونوں بیانیے کسی نہ کسی شکل میں اپنے قومی ہیروز کے تعین میں ایک ہی صف پر ہیں۔ وہ ہے مختلف تاریخی ادوار میں توسیع پسند حکمران طبقے کی صف ...... قومی ہیروز کی تشکیل میں دونوں بیانیے اپنے اپنے

مخصوص مفادات اور من پسند نتائج کے حصول کیلئے حکمران گروہوں کے حملہ آوروں، توسیع پسند حکمرانوں کو اپنے قومی ہیروز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہاں سے ان کے نیشنل ازم کی طبقاتی صف بندی اور طبقاتی مفادات کی عکاسی بھرپور طریقے سے ہوتی ہے۔ دنیا بھر کے محنت کشوں ایک ہو جاو کے علمبردار بعض نام نہاد ترقی پسند حلقوں نے بھی اپنے مخصوص مفادات اور Bias کی بدولت پاکستان کے محنت کشوں کو ایک کرنے کی بجائے مخصوص مفادات اور گروہوں کے اٹھائے ہوئے ثقافتی اور لسانی نیشنل ازم کا ڈھنڈورچی بننے کا کردار ادا کیا۔ بائیں باوز کے اس مکتبہ فکر کی نئی پود مغربی اور یورپی یورنیوسٹیوں سے فارغ التحصیل امریکی اور برطانوی سفارت خانوں کی مالی امداد سے منعقدہ لٹریری میلوں کے پیدا کردہ پوسٹ ماڈرنسٹ دانشوروں کی ہے جو اپنے مخصوص ایجنڈے کے تحت پاکستان میں کامریڈ اسٹالن کی قومی تعریف کی میکانکی تشریح کرتے ہوئے ہر ۶۰۔۵۰ میل کے بعد ایک نئی قوم تشکیل کرتے رہتے ہیں اور قومی آزادی اور حق علیحدگی کی جہدوجہد میں مصروف عمل ہے۔ پاکستانی بائیں بازو کی ایک بڑی تعداد اور پارٹیاں نسلی، لسانی و ثقافتی قوم پرستی کی قائل ہیں اور اس بنیاد پر پاکستان کو کثیر القومی ریاست قرار دیتی ہیں اور قوموں کے حق خود اختیاری بشمول حق علیحدگی کی حمایت کرتی ہیں۔ اپنی پارٹیوں کے ناموں میں پاکستان کے لفظ سے بیزار یہ بائیں بازو کی پارٹیاں اپنے موقف کے حق میں لینن کی تحریروں کے اقتباسات پیش کرتی ہیں۔ لینن کی ان مضوعات پر تحریروں کو ہم سوویت یونین کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ سوویت یونین کرہ ارض کے چھٹے حصہ اور پاکستان سے 28 گناہ زیادہ رقبہ پر مشتمل ہے جو کہ دو براعظموں میں واقع تھا وہ ایک کثیر القومی ریاست تھی اور اس تناظر میں لینن کی تحریروں میں بڑا وزن تھا لینن کے ذہن میں قوم کا تصور کیا تھا؟ اس کا پتہ سوویت یونین کے دستور سے لگانا چاہیے۔ سوویت یونین کے دستور میں صرف یونین ریپبلکس کو حق

علیحدگی دیا گیا اور انہیں قومیں تسلیم کیا گیا۔75 فیصد آبادی پر مشتمل وولگا دریا کی وادی کو صرف ایک یونین ریپبلک یعنی ایک قوم تسلیم کیا گیا تھا اس میں کئی نسلی ثقافتی گروہ آباد تھے اس کے اندر کئی خودمختار ریپبلک (Autonomous Republics) خودمختار علاقے (Autonomous Areas) اور قومیتں تھیں جنہیں حق علیحدگی حاصل نہیں تھا۔ کریمیا کا روس نسلی، لسانی، ثقافتی علاقہ وولگا ردریا کی وادی سے باہر ہونے کی وجہ سے یوکرائن میں شامل تھا چیچن اور تاتارستان کے غیر روسی آبادی کے علاقے رشین فیڈریشن میں شامل تھے۔ نورکاراباخ کا آرمینیائی آبادی کا علاقہ آذربائیجان میں شامل تھا۔

اسکے باوجود نسلی وثقافتی(Ethno-Culture) گروہوں کو جو حقوق دیئے انہوں نے ثقافتی (Status Que) کی اتنی مضبوط دیوار کھڑی کردی کہ تبدیلی کی تمام لہریں پاش پاش ہوگئیں۔ سوویت یونین منہدم ہوگیا اور ریشین فیڈریشن اپنی جغرافیائی حدود میں قائم رہی۔ اس کتاب میں شامل مختلف مضامین ان تمام موضوعات کا بھرپور طریقے سے احاطہ کرتے ہوئے پاکستان کے محنت کش طبقے کے مشترکہ طبقاتی وسائل و مفادات کے حصول کیلئے نئی قومی تشکیل اور طبقاتی صف بندی کی اہمیت اور ضرورت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو یہ ہماری کاوش پسند آئے گی اور ہم اس سلسلے میں آپ کی رائے اور تعاون کے طلب گار رہیں گے۔

ترتیب وتدوین:
محمد سلیم شیخ

# قومی مسئلہ

ہندوستان کی تحریک آزادی ہندوستانی قوم کی بنیاد پر چل رہی تھی۔قوم پرست اور بائیں بازو والے اس کے حامی تھے۔ یہ تحریک آزادی، انگریزوں کے خلاف تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں قوم پرستوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی جبکہ کمیونسٹوں نے ان کی حمایت کی۔اس کے بعد پاکستان ہندوستان میں مسلمان قوم کے نام پر وجود میں لایا گیااور ہندوستانی لیفٹ نے اس کی بھی حمایت کی۔قیامِ پاکستان کے بعد سیکولر بھارت کے مہاتما گاندھی نے رام راج کا نعرہ لگایا اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے سیکولر پاکستان کی بات کی اور دونوں اپنی اپنی گاڑیوں تلے کچلے گئے۔ بھارتی لیفٹ نے تو اپنا قبلہ درست کیا، مذہبی، نسلی، لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر استوار قومی تحریکوں سے کنارہ کشی اختیار کی حتیٰ کہ کشمیریوں کے حق خودارادیت تک کی حمایت سے دستبردار ہو گئے۔

پاکستانی لیفٹ بھارتی لیفٹ کی پیروی میں مذہبی ہی نہیں، ہر قوم پرستی سے انکاری ہوا۔ پاکستان کے وجود کا منکر اور کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت سے بھی دستبردار

ہوا اور پاکستان دشمنی میں پاکستان کے اندر نسلی، لسانی اور ثقافتی بنیاد پر اٹھنے والی ہر خودمختاری اور نیم خودمختاری کی قومی تحریک کا غیر مشروط حامی بن گیا۔ اس طرح انہوں نے عوامی نفرت سمیٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ایک طویل عرصہ کارزار سیاست میں ناکام صحرانوردی کے بعد یہ لوگ پاکستان کو ایک کثیر القوامی ریاست تسلیم کرنے پر رضامند ہوئے۔

ہماری نظر میں قوم ایسا انسانی گروہ ہوتا ہے جو اپنی خودمختار ریاست قائم کرنے کی صلاحیت اور حق رکھتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو ہمسایہ قوموں سے اپنی من پسند شرائط پر اتحاد کر کے کنفیڈریشن قائم کرسکتا ہے اور جب چاہیے اسے توڑ سکتا ہے۔ پاکستانی قوم ہماری لغت میں کوئی وجود نہیں رکھتی۔ لہٰذا ہم اس کثیر اقوامی ریاست کا وجود عالمی طاقتوں کے حلیف حکمران طبقہ کی صوابدید پر تسلیم کرتے ہیں اور وہ اگر اسے ختم کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا؟

قوم کی تشکیل مذہب وملت، رنگ ونسل اور زبان وثقافت میں سے کسی بھی بیانیہ پر کی جائے یہ تعصب، تسلط، تشدد، فرقہ واریت اور تقسیم در تقسیم کے لامتناہی سلسلوں کو جنم اور نشوونما دیتی ہے۔ دنیا پر حکمرانی قائم کرنے اور رکھنے کا یہی سامراجی طریقہ ہے۔ اس راستہ پر چلتے ہوئے سامراجی جکڑ بندی سے نجات اور انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی ہر شکل کے خاتمے کی بات دراصل سامراجی مفادات کے تابع سامراج دشمنی ہے۔ یہ عمل سامراجی مفادات اور انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی ہر شکل کے حق میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اس قسم کی قوم پرستی کے بارے میں رقمطراز ہیں ''نیشنلزازم آج بھی امریکی امپیریلزم کا بنیادی ستون ہے''۔ جس کے سہارے سے وہ اپنے تسلط کو عالمی طور پر بڑھا رہا ہے۔ نو آزاد ملکوں میں اب بھی نیشنلزم علیحدگی پسند جماعتوں کیلئے ایک نظریہ ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کررہے ہیں۔

پاکستانی مارکسسٹوں کو قوم کی مادی تشریح کرنا ہوگی مذہب کے نام پر قومی تشکیل نے ہمیں فرقہ واریت تعصب اور تشدد سے نوازا ہے۔اس کی آڑ میں سامراجی تسلط اور مستحکم ہوا ہے۔رنگ ونسل اور زبان وثقافت کی بنیاد پر قومی تشکیل کے نتائج اور بھی سنگین ہو سکتے ہیں۔ان تحریکوں کے پس منظر میں حکمران طبقہ کے مخصوص گروہ اوراس کے مخصوص مفادات تو ضرور ہیں لیکن عوام کے مفادات سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ قومی تشکیل کی کوئی مستحکم اورترقی پسندانہ بنیادنہیں ہیں۔ پاکستان لاتعدادنسلی،لسانی اورثقافتی گروہوں کا مجموعہ ہے۔ یہ گروہ مٹتے اورابھرتے رہتے ہیں۔خودمختارقوم اورریاست ان کی بجائے اپنے وجود کیلئے مادی لوازمات پرانحصار کرتی ہے۔ یہ اسے اس کا جغرافیہ فراہم کرتا ہے۔جغرافیہ ہی اسے اس کی تاریخ فراہم کرتا ہے۔ول ڈیوارنٹ نے بھی لکھا ہے کہ جغرافیہ تاریخ پیدا کرتا ہے،رنگ و نسل اورزبان وثقافت کی بنیاد پرقوم کا تصور پسماندہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔

قوم اگرخودمختارریاست کا حق رکھتی ہے تو حق صلاحیت کے بغیر نہیں ہوتا۔قوم کے پاس خودمختار ریاست قائم کرنے اور رکھنے کی صلاحیت ہونا بھی ضروری ہے۔ اس صلاحیت کیلئے خودمختارریاست کے مادی لوازمات درکار ہیں۔ان لوازمات میں رنگ ونسل اورزبان وثقافت کا درجہ بہت چھوٹا ہے اور یہ بتدریج ناپید ہوتا جارہا ہے۔ مادی لوازمات میسرآنے پر ہندوستان پرمشتمل سلطنت مغلیہ کی ریاست بھی قائم ہوسکتی ہے۔

اپنی بقاء،نشوونما اورترقی کیلئے خودمختار( آزاد )،مشترک اورنا قابل تقسیم قدرتی وسائل رزق پرانحصار کرنے والا انسانی گروہ بلاامتیاز مذہب وملت، رنگ ونسل اورزبان و ثقافت ایک قوم کہلاتا ہے۔ایسی ہی قوم اپنی آزادریاست قائم کرنیکا حق اورصلاحیت رکھتی ہے۔خودمختاری کے مادی لوازمات سے محروم ریاستیں اپنی بقاء کیلئے خارجی طاقتوں کے لطف وکرم کی محتاج ہوتی ہیں اورعوام کی بجائے اپنے آقاؤں کے مفادات اورخواہشات کی

بجا آوری پر تکیہ کرتی ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے عوام دشمن اور سامراج نواز رویے ہمارے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہونا چاہئیں۔ حیرت تو محنت کش عوام کے عالمی اتحاد کے داعیوں کے نسلی، لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر قومی تشکیلات کے ذریعے عوام کی تقسیم در تقسیم کی حمایت کے رویے پر ہوتی ہے۔ خان قلات، لغاری، مغلوں، انگریزوں، درانیوں اور ابدالیوں کے سامنے کبھی خودمختاری کا دعویدار نہیں ہوا؟

کامیاب حکمران خودمختار ریاست کے مادی لوازمات سے ہمیشہ آگاہ رہے ہیں۔ ہندوستان کے پہلے مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر نے وسطیٰ ایشیاء سے جنوبی ایشیاء کا رخ کیا تو کئی علاقے فتح کرنے کے بعد وہاں اپنی سلطنت قائم کرنے سے صرف اس لیے اجتناب کیا کہ یہاں کے مادی وسائل بادشاہت (خودمختاریت) کے متحمل ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ بامیان اور قلات کی فتوحات کے موقعوں پر اس کا یہ مؤقف اس کی خودنوشت ''تزک بابری'' میں بصراحت درج ہے۔

حجاج بن یوسف نے سندھ پر حملوں کی اجازت لینے کیلئے جو درخواست خلیفہ اول کو دی، اس میں سندھ کے ساحل کے قریب عرب تاجروں کے لٹنے کا کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ وہ راجہ داہر کی ریاست میں اپنے ایجنٹوں کی طاقت کے حوالہ سے اس فوجی مہم کی کامیابی کے احکامات، اس پر ہونے والے اخراجات اور مال غنیمت کی شکل میں محصولات، منافع، خلیفہ گورنر اور سپاہ کے حصول کے اعداد و شمار پیش کر کے حملہ کی اجازت کا طالب ہے۔ کامریڈ ماو کے بقول کوئی جرنیل اپنے مادی وسائل سے بڑی جنگ نہیں لڑ سکتا۔ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل بھی کہتے ہیں کہ جنگوں کے فیصلے میزوں پر ہو چکے ہوتے ہیں میدانِ جنگ میں صرف رسم ادا کی جاتی ہے۔ انہوں نے کسی موقع پر امریکی سرپرستی سے محرومی پر پریشان مجاہدین کو دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا کمیونسٹ بڑی تیزی سے ازسرنو منظّم ہو رہے ہیں اور بہت

جلد امریکہ کو تمہاری ضرورت پڑے گی۔ غور کریں اہداف سب کے اپنے اپنے ہیں لیکن اپروچ سب کی ماوی ہے سب مسئلہ کی مادی تشریح کرتے ہیں۔

پچاس امریکی ریاستوں نے متحد ہو کر ایک خودمختاری کے مادی لوازمات کی حامل ریاست (یوایس اے) قائم کی ہے۔ یورپی ممالک اپنی خودمختاری کے بارے متفکر ہیں اور آپس میں اتحاد و اشتراک بڑھا کر یورپی یونین اور ریاستہائے متحدہ یورپ بنانے کے منصوبہ پر گامزن ہیں۔ حالانکہ اُن میں ماضی کی چار عالمی طاقتیں اور دو ویٹو پاورز برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی بھی موجود ہیں۔ آلات پیداوار کی ترقی انہیں یورپی قوم اور ریاست تشکیل دینے پر مجبور کر رہی ہے۔ پاکستانی بائیں بازو کے سوا دنیا کے کسی خطے کے بایاں بازوؤں میں عوام کی تقسیم در تقسیم پر منتج ہونے والی تنگ نظر، متعصب اور ناعاقبت اندیش قوم پرستی کی حمایت نہیں کرتا۔ جزیرہ نمائے عرب کا بایاں بازو عرب قوم کی بات کرتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے عرب قوم کو ایک کثیر الریاستی قوم کے طور پر کامیابی سے اجاگر کیا ہے۔ یہ سامراجی جکڑ بندی کیلئے ایک خطرناک علامت ہے۔ بھارتی بایاں بازو بھارتی ایکتا کے خلاف کسی قوم پرست تحریک کی حمایت نہیں کرتا۔ ہند چینی اور لاطینی امریکہ کی سوشلسٹ تحریکیں بھی ریاست کو جوڑنے کی جدوجہد کرتی ہیں تقسیم کرنے کی حمایت نہیں کرتیں۔

مادی مفادات کے مقابلہ میں رنگ ونسل اور زبان وثقافت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ امریکی اور یورپی قومیت وشہریت حاصل کرنے کیلئے لوگ رنگ ونسل سے بے نیاز ہو کر ان ممالک میں شادیاں کرتے ہیں۔ حسب مفادات لوگ بدیشی زبانیں سیکھتے ہیں، لباس اور وردیاں پہنتے ہیں۔ ایسا کرنے میں فخر بھی محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس سے بہتر معاشی مواقع میسر آتے ہیں۔ کم و بیشتر تمام دانشوران عصبیتوں کو رد کرتے ہیں۔ کچھ مفاد

پرست گروہ ان عصبیتوں کی بنیاد پر قومیں تشکیل دیتے رہتے ہیں اور قومی تحریکیں پیدا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، ان کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔

مکا لہرانے کی آزادی دوسرے کی ناک کو خطرہ لاحق ہونے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ اس اصول کے تابع تمام مذہبی، نسلی، لسانی اور ثقافتی سرگرمیوں کو ریاستی معاملات اور دوسرے گروہوں کی آزادیوں میں عدم مداخلت کی شرط پر اپنے عقائد ونظریات کے مطابق زندگی گزارنے اور سرگرمیوں کی آزادی ضروری ہے۔ ان آزادیوں کو قانونی اور انتظامی تحفظ دینا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کیلئے قانون سازی اور اس کے نفاذ کیلئے مناسب بااختیار انتظامی اکائیاں اور ادارے بھی بنانے چاہئیں۔ ہر خطہ کے عوام کو اس خطہ کے وسائل پر پہلا حق استفادہ حاصل ہونا چاہیے۔ عوام ایک دوسرے کے یہ حقوق تسلیم کرتے ہیں اور ان کا نفاذ اور حصول چاہتے ہیں۔ ان معاملات پر جھگڑا حکمران طبقہ کے گروہوں کا ہوتا ہے اور عوام کو اس میں مکارانہ چالوں سے گھسیٹ لیا جاتا ہے۔

حکمران طبقہ میں گروہی تقسیم حاوی مفادات کے اشتراک اور تفریق کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ وہ عوام پر حکمرانی کرنے اور اپنے گروہی مفادات کو بڑھاوا دینے کی خاطر مذہبی، نسلی، لسانی اور ثقافتی رنگا رنگی میں تعصب کا زہر گھول کر، تسلط کے جذبات بھڑکا کر تشدد کا راستہ کھولتے ہیں اور انہیں تقسیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی پاکستانی نیشنلزم بارے لکھتے ہیں۔ پاکستان میں نیشنلزم کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت زیادہ پیچیدگی نظر آئے گی کیونکہ دوقومی نظریہ کی وجہ سے اس کے نیشنلزم کی بنیاد مذہب پر تھی۔ جب ملک آزاد ہونے کے بعد بھی اس کی یہی تشریح کی جاتی رہی تو اس نے بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے دائرہ سے نکال دیا لیکن یہ مذہبی نیشنلزم اپنی لفاظی اور جذبات کے باوجود پاکستانی قوم کی تشکیل نہیں کرسکا۔ اس کے خلاف جو علاقائی یا صوبائی نیشنلزم پیدا ہوئے اُن میں سے بنگال اور

سندھ نے زبان کی بنیاد پر مرکزی نیشنلزم کا مقابلہ کیا۔ دوسرے صوبوں میں اس کی بنیاد کلچر پر تھی۔ جس نے ترقی یافتہ ذہن کی بجائے پسماندہ ذہن پیدا کیا۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں جاگیردار اور قبائلی سردار مضبوط ہوئے۔ لہٰذا تاریخ کے اس موڑ پر پاکستان کو نیشنلزم کی ایک نئی تشکیل کرنا ہوگی جو پسماندگی کی بجائے ترقی کی جانب معاشرے کو لے جاسکے۔

اس وقت افغانستان اور عراق سمیت دنیا کے طول وعرض میں قدرتی وسائل رزق پر قبضہ کی جنگیں جاری ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمہ کے اعلان کے بعد پُرامن جمہوری دنیا وجود میں آنے کی بجائے عالمی سطح پر عسکریت گردی میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں اس نظام کے اندر رہتے ہوئے حکمران طبقہ کے گروہی مفادات کا تصادم اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ بندوق الٹتی، آئین معطل ومنسوخ اور اسمبلیاں برطرف ہوتی ہیں۔ صدر اور وزیراعظم قید اور جلاوطن ہوتے ہیں اور تختہ دار پر لٹکتے ہیں۔ سیاسی کارکنوں کی ٹارگٹ کلنگ، ایذا رسانی اور سنگ زنی ہوتی ہے۔ اس صورتحال میں ہمارے سیاسی قائدین ایک طرف ریاست کے قانون، آئینی اور جمہوری اداروں کی بے بسی کا نظارہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف جمہوری جدوجہد اور آئینی وقانونی اصلاحات کے ذریعے اس نظام کی اصلاح کی بجائے نظام بدل دینے کا مصنوئی راستہ دکھاتے ہیں۔ جمہوریت اور جمہوری دور کے راگ الاپتے ہیں۔ اس رویے کو سامراج دشمنی کے سامراجی ایجنڈے کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

سامراجی طاقتوں نے بلقانی ریاستوں میں بائیں بازو کی سیاسی طاقت ختم کرنے کی غرض سے مذہب اور نسلی قوم پرستی کا استعمال کیا ہے اور بائیں بازو کی مزاحمت کا سامنا بھی کیا ہے۔ وہاں کئی علاقوں میں بائیں بازو کی جغرافیائی قوم پرستی کے خلاف نیٹو فورسز کا استعمال اور تعیناتی بھی عمل میں لائی گئی۔ بایاں بازو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کی حمایت کے بعد سامراج دشمن اسلامی انقلاب کی حمایت کا تجربہ ایران میں بھی کر چکا ہے

لیکن ان تجربات کے برعکس چینی کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کی جاپان کے خلاف متحدہ قومی دفاع وگزاری کی جنگ کا تجربہ بھی منچوریا میں ہو چکا ہے۔ پاکستان میں جغرافیائی بنیادوں پر پاکستانی قوم پرستی پیدا ہی نہیں ہونے دی گئی۔ یہ اس خطہ میں سامراج کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور بابایاں بازو اس میں نمایاں حصہ دار ہے۔

ہمارے سیاسی قائدین اور دانشور خودمختاری کے مادی لوازمات سے محروم خودمختار قوم اور ریاست کے سراب سے باہر آئیں۔ یہ بات خودمختاری کی مادی تشریح سے متصادم ہے اور نہیں ہوسکتا۔ مادی لوازمات رنگ ونسل اور زبان وثقافت کی بنیاد پر قوم اور خودمختار ریاست کا تصور بالکل باطل اور ناقابل عمل ہے۔ بلوچستان، سندھ، خیبر پختونخواہ، پنجاب، سرائیکی، ہزارہ، گلگت بلتستان، بہاولپور وغیرہ الگ الگ ریاستیں رہی ہیں اور بن سکتی ہیں، لیکن نہ تو خودمختار ریاستیں رہی ہیں نہ بن سکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی خودمختاری کے مادی لوازمات کا حامل نہیں۔ طفیلی ریاست کا کردار عوام دشمن ہوتا ہے۔ ان ریاستوں نے ماضی میں عوام کو غربت پسماندگی، جہالت اور غلامی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں کو محض جرائم کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ ایک برطانوی خاتون نے لندن کی عدالت میں ایک شخص کے خلاف ریپ کا مقدمہ دائر کیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ملزم نواب بہاولپور ہے۔ عدالت نے ملزم کو ایک خودمختیار ریاست کا مقتدر اعلیٰ قرار دیتے ہوئے اپنے آپ کو اختیار سماعت سے محروم گردانا اور مقدمہ خارج کر دیا۔ اگر یہی مقتدر اعلیٰ ڈیرہ غازی خان کی بلوچ سرکشی کو کچلنے کیلئے انگریزوں کا ساتھ دینے سے انکار کرتا تو اس کی خودمختاری کی صورتحال اس کے بالکل برعکس ہوتی۔ پاکستان بھی اسی قسم کی ایک آزادانہ خودمختار ریاست ہے۔ اس کے سربراہ اور سفارتکاروں کو غیر ممالک میں مقدمات سے استثناء حاصل ہے لیکن ہمارے سربراہ مملکت کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ افغان جنگ میں اپنے عوام کے جذبات کا

احترام کرتے ہوئے امریکہ سے تعاون نہ کرے۔اسے نہ صرف تعاون کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے بلکہ اسے اور اس کے حواریوں کو ایسے مدبرانہ اور جرأت مندانہ فیصلہ پر خوشی سے ناچنا بھی پڑتا ہے کہ ہم نے ایسا کر کے ملک کو ایک بڑی تباہی سے بچالیا ہے۔یہی نہیں آگے چل کر امریکہ کا ممنون بھی ہونا پڑتا ہے کہ وہ پاکستان کی جنگ لڑ رہا ہے۔اس تدبر و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ حکمران فاٹا، خیبر پختونخواہ، بلوچستان اور کراچی میں قتل عام کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ملک بھر میں ٹارگٹ کلنگ اور دہشت گردی (خودکش حملوں اور بم دھماکوں) کا سلسلہ جاری ہے۔مہنگائی اور بیروزگاری کا عفریت بھی عوام کو نگل رہا ہے۔

خان عبدالغفار خان جنہیں سرحدی گاندھی بھی کہا جاتا ہے قیامِ پاکستان تک ہندوستانی قوم پرست تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ بھارتی قوم پرست بنے اور خیبر پختونخواہ کے بھارت سے الحاق کیلئے ریفرنڈم بھی لڑا۔اس مقصد میں ناکامی کے بعد وہ پشتون قوم پرست بن گئے۔کبھی ان علاقوں پر مشتمل پشتون ریاست اور کبھی ان علاقوں کو افغانستان میں شامل کر کے عظیم تر پشتونستان کا دعویٰ کیا۔وہ پنجاب کے ضلع میانوالی پر اپنا حق جتاتے رہے۔انہوں نے اپنی تدفین کیلئے بھی ان کے بقول پشتونوں کی آزاد سرزمین میں (جلال آباد، افغانستان) کا انتخاب کیا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے پاکستانی پشتونوں کو بھارت میں شامل کرنیکی پشتون عوام کے ہاتھوں ناکام کوشش کے بعد پشتون اتحاد کا مقصد حاصل کرنے کیلئے جنوبی افغانستان کو پاکستان میں شامل کرنے کا مؤقف کیوں نہ اختیار کیا؟ روسیوں کیلئے بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی کلیدی اہمیت کی حامل قرار دی جاتی ہے اور اس مقصد کیلئے وہ افغانستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔کیا پشتونوں کے ان گرم پانیوں اور سندھ و پنجاب کے میدانوں سے کوئی مفادات وابستہ نہیں ہیں۔ وہ یہ مؤقف اپنا کر وادی سندھ کی جغرافیائی وحدت کو سیاسی

وحدت میں بدلنے کا کام بھی کر سکتے تھے۔آج ان کے جانشینوں کی سیاست کا محور پشتون قوم پرستی کے حوالہ سے کراچی کیوں بن گیا ہے؟ بلوچوں اور پنجابیوں کیلئے بھی سندھ اور کراچی مسئلہ کیوں بن گیا ہے؟ اگر پنجاب میں پنجابی قوم پرست تحریک بھی سندھی اور مہاجر قومی تحریکوں کا سا رخ اختیار کر لے تو اسے دوسرے صوبوں میں اپنی قومی سیاست کرنا پڑے گی اور دوسرے صوبوں کی قوم پرست تحریکیں پنجاب سے بے نیاز نہیں رہ سکیں گیں کیونکہ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان سے زیادہ پشتون اور بلوچ پنجاب میں بستے ہیں اور پنجابی بھی تمام صوبوں میں بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ان کے یہاں مفادات بھی ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ متذکرہ بالا تمام نسلی،لسانی اور ثقافتی گروہ پورے ملک میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ بستے ہیں۔انہیں علاقائی بنیادوں پر الگ الگ اقوام میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔انتظامی اور ترقیاتی ضرورتوں کے پیشِ نظر حسب ضرورت حلقہ بندی کی جانی چاہیے۔انہیں مل جل کر ایک سیاسی وحدت میں ایک قوم کے طور پر چلنا ہوگا کہ اسی میں سب کا بھلا ہے۔کوہِ ہمالیہ اور اس کی شاخوں کوہ لداخ،کوہِ ہندا کش،کوہِ قراقرم،کوہِ کیرتھر اور کوہِ سلیمان کی چوٹیوں اور ڈھلانوں پر پڑنے والی برفوں اور بارشوں کے پانیوں پر پنجاب اور سندھ کے میدانوں کی زندگی کا انحصار ہے۔ان پہاڑی علاقوں کے میدانوں پر حقوق سے صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ وہ رنگ ونسل اور زبان وثقافت کے لحاظ سے الگ قوم ہیں اور وہ ان پانیوں کو روک نہیں سکتے۔اگر وہ ان پانیوں کو روکنے پر قادر ہو جائیں تو ان کا میدانوں کی زندگی برباد کر دینے کا حق کیا تسلیم کر لیا جائے؟ یہ منفی طرز فکر حکمران طبقہ کا ہوتا ہے وہ مفلوک الحال سماج،اپنی بالا دستی اور حکمرانی کے ماحول میں راحت پاتے ہیں۔عوام سکھی سماج، برابری اور باہمی احترام ومحبت کے ماحول میں خوش رہتے ہیں۔یہ دونوں طبقوں کا نفسیاتی فرق ہے۔

مجھے جی ایم سید کے سندھی نیشنلزم سے ہمدردی ہے۔ پورے برصغیر میں مذہب کی بنیاد پر مسلم ریاست کے قیام کی قرارداد سب سے پہلے سندھ مسلم لیگ نے منظور کی اور یہ قرارداد جی ایم سید نے پیش کی تھی۔ اس ریاست کے قیام کے نتیجہ میں جس طرح سندھی سندھ میں بے توقیر ہوئے یہ اسی کا ردعمل تھا۔ اسے فطری ردِعمل تو شاید کہا جاسکے لیکن شعوری یا سائنسی نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے منفی نتائج کا حامل رہا۔ شیر محمد مری نے حیدرآباد جیل سے ایک بیان میں کہا تھا قیام پاکستان کا دراصل مطلب وسطی اور جنوبی ہند کی مسلم اشرافیہ کی وادیٔ سندھ پر فتح تھی۔، شیر محمد مری صاحب کی زبانی یہ قیامِ پاکستان کی مادی تشریح کا ایک پہلو ہے۔ جس میں قوم کا تصور بالکل واضح ہے۔ اگر اس میں ریاست کا قیام مذہب کی بجائے سندھ اور ہند کی تاریخی اور جغرافیائی تقسیم، وادی سندھ کی جغرافیائی وحدت اور وسائل رزق کے اشتراک وخودمختاری کی بنیاد پر عمل میں آتا تو صورتحال بالکل مختلف ہوتی۔ نہ انتقال آبادی کا مسئلہ پیدا ہوتا اور نہ ہی مذہبی فرقہ واریت متشدد ہوتی اور نہ مذہبی مرکزی نیشنلزم کے خلاف صوبائی اور علاقائی نیشنلزم پیدا ہوتے۔ لیکن اب ہم غلط راہوں پر چلتے ہوئے جہاں پہنچے ہیں یہیں سے جانب منزل رخ کرنا ہوگا۔

وادیٔ سندھ ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ رقبہ، آبادی اور قدرتی وسائل رزق کے لحاظ سے خودمختار سیاسی وحدت کی صلاحیت حق اور ضرورت رکھتی ہے۔ اسکے اندر موجود نسلی، لسانی اور ثقافتی گروہ باہم شیروشکر ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق تسلیم کرتے ہیں۔ ہر خطہ کے وسائل پر وہاں کے عوام کا اختیار بھی سب مانتے ہیں۔ بلوچستان کی گیس، کوئلہ اور دوسرے معدنیات پنجاب اور دوسرے صوبوں کے عوام مفت استعمال نہیں کرتے۔ وہ اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ قیمت بلوچ عوام کی بجائے کسی اور کی تجوری میں چلی جاتی ہے تو ہم سب کومل کر اسے روکنا ہوگا۔ اگر اس مسئلہ کی مادی تشریح کی جائے تو یہ طبقاتی مسئلہ

بن جاتا ہے۔ پاکستان کے حکمران طبقہ کی بقاء سامراجی تسلط سے وابستہ ہے۔ سامراجی تسلط کے خاتمہ کے بغیر پاکستان کے عوام کو اپنے وسائل رزق کا حق نہیں مل سکتا۔ یہ طبقہ اپنی بقاء اور سامراج اپنے تسلط کو دوام دینے کی خاطر پاکستان کو تقسیم کر کے سامراج کے زیر حفاظت عرب امارات کی طرز پر ریاستیں بنانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کیلئے ریاستی ادارے عوام پر مسلسل جنگ مسلط کیے ہوئے ہیں اور حکمران طبقہ عوام کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کر رہا ہے۔ سابق والیان ریاستہائے قلات اور بہاولپور کا اس سلسلہ میں غیر معمولی طور پر متحرک ہونا عالم بالا کے ارادوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

وادئ سندھ کے پہاڑ، دریا، سطح مرتفع، ڈیلٹا، ساحل اور سمندر اس کے باسیوں کے مشترکہ وسائل رزق ہیں۔ ان سے مشترکہ طور پر ہی استعفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تقسیم انہیں بیکار کر دیتی ہے۔ ماضی میں اس تقسیم نے ہمیں غربت، جہالت، پسماندگی اور غلامی کا شکار کیا ہے۔ ہمیں تاریخ کو بھلانے یا دہرانے کی بجائے اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ قدرتی مادی وسائل رزق کا اشتراک ہمیں ایک قوم بناتا ہے اور ہم ایک قوم ہیں۔ پاکستان ایک کثیر الاقوامی ریاست نہیں ہے۔ یہاں پاکستانی قوم بھی بستی ہے۔

امریکہ، چین، روس اور بھارت کی بڑی ریاستوں کے سامنے چھوٹی ریاستوں کی بے بسی نے چھوٹی ریاستوں کے عوام کو اپنی خود مختاری (اقتدارِ اعلیٰ) شیئر کرنے کا راستہ دکھایا ہے۔ یورپ اور عرب کثیر الریاستی قوموں کے طور پر ابھرتے ہیں۔ افریقہ، ہند چینی، مشرق بعید اور لاطینی امریکہ کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ آلات پیداوار کی ترقی نے بڑے پیانے کا اشتراک ناگزیر بنا دیا ہے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی جیسے ممالک یورپی یونین اور یونائیٹڈ سٹیٹس آف یورپ کے حق میں اپنا اقتدار اعلیٰ شیئر کرنے

کے لیے تیار ہیں، اور ہمارے ہاں قلات اور بہاولپور اپنے آپ کو خود مختار ریاست بنانے پر مصر ہیں، اسے پسماندہ ذہنیت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

ہماری تاریخ آثار قدیمہ کے کھنڈروں میں دفن ہو چکی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ہماری تاریخ برہمنوں کے بھجنوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ بھجن دیو مالائی قصے بیان کرتے ہیں جن کا تاریخی حقائق سے واجبی سا تعلق ہو سکتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے مطالعہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں انہیں بھی تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جب شہر زندہ تھے تب ان کے نام کیا تھے۔ ان آثار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ ہم ان کھنڈروں کے باسیوں کا تہذیبی تسلسل ہیں۔ ورنہ ہم ان کھنڈروں پر استادہ ٹیلوں کو موہن جو داڑو (مردوں کے ٹیلے) نہ کہتے۔ گو ہمیں معلوم نہ کہ ان کو یہ نام کیوں دیا گیا۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے نام سنا تھا جو کھدائی پر درست ثابت ہوا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ یہ ایک پر امن تہذیب تھی۔ کیونکہ یہاں معبد ملتے ہیں، قلعے نہیں ملتے، یہاں زیورات ملتے ہیں۔ ہتھیار نہیں ملتے، تانبے اور کانسی کی پگھلائی اور ڈھلائی کا انتظام موجود ہے۔ پکے مکانات اور وافر تعداد میں مہمان خانے، فراہمی و نکاسی آب کا اعلیٰ انتظام اور دجلہ، فرات اور نیل کی تہذیبوں سے تعلقات کے شواہد اس تہذہب کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ آریہ سماج وادی ہندومت میں موجود ذاتوں (ذات پات) میں انسانی تقسیم یا غلامی کے کوئی شواہد نہیں ملے۔ اگر اس قسم کی اس سماج میں کوئی تقسیم ہوتی تو طبقاتی کشمکش بھی ہوتی، جنگی کلچر بھی ہوتا اور بڑی تعداد میں قلعے اور ہتھیار بھی دریافت ہوتے۔

جنگی کلچر سے نابلد اس تہذیب کے پروان چڑھنے میں ہزاروں سال لگے ہونگے اور اس عرصہ میں اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس کے جغرافیہ یعنی اس کے گردا گرد موجود پہاڑی، صحرائی سلسلوں اور سمندروں نے نبھائی ہوگی۔ رامن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک

سول سوسائٹی کی تہذیب تھی۔شاہی محلات اور درباروں کا وجودنہیں ملتا۔انسانی اورحیوانی زندگی ان لوگوں کی نظر میں بڑی مقدس شے تھی۔ یہ لوگ گوشت خورنہیں تھے۔جس معاشرہ میں اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے پالتو یا جنگلی جانوروں کی جان لینا حرام ہو وہاں انسانوں کے مابین جنگ وجدال اورقتل وغارت کا تصورنہیں کیا جاسکتا۔ایسی سماجی قدروں کی موجودگی میں ریاستی حکمرانی،انتظام وانصرام اور جبر کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ریاستی جبر کی عدم موجودگی میں یہ ایک ابتدائی اشترا کی سماج تھا۔نظم ونسق اور سماجی پھیلاؤ کے کاموں کی ذمہ داری پنچائتوں اور جرگوں پرتھی۔ یہ پنچائتیں اور جرگے اس خطہ میں آج کے طبقاتی سماج میں بھی حکمران طبقہ کے مخصوص مفادات کی حفاظت کیلئے استعمال ہورہے ہیں اور مشکل حالات میں ریاستیں بھی ان کا سہارا لینے پر مجبور ہوتی ہیں۔

میں نے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے کھنڈرات کا مطالعہ کیا ہے۔ وہاں پر موجود ملکی اور غیر ملکی معروف محقق اور ماہرین آثارِ قدیمہ سے اس تہذیب کے حوالے سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کیا۔ کچھ ماہرین کی تحقیقاتی رپورٹوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ یہ تہذیب قدرتی آفات کا شکار ہوئی۔ اگر یہ تہذیب سیلابوں اور زلزلوں کا شکار ہوئی ہوتی تو مکانات اور دوسرا انفراسٹرکچر مہندم اور ٹوٹا پھوٹا ہوا دریافت ہوتا اور اگر وبائی بیماریوں کے سبب یہ بربادی ہوئی تو زیورات اور دوسری قیمتی اشیاء نکاسی آب کے گھڑوں سے برآمد نہ ہوتیں۔

کھنڈرات کے ایک مٹی کے ڈھیر سے تیز دھار آلات سے کٹی ہوئی خاکستر انسانی ہڈیاں دریافت نہ ہوتیں۔ سرخ آندھی کو قتل انسانی کے خلاف آسمان کا اظہار برہمی قرار دینے والے یہ لوگ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کے قتل وغارت گری اور خوف ودہشت اور لوگ مارا ماری کا تصور کیسے کر سکتے تھے۔ وہ طبقاتی سماج کے ان بنیادی لوازمات سے

نا آشنا تھے۔ اتنی عظیم تہذیب کے حلقوں کا اپنے گردونواح کے بارے میں اتنا لاعلم ہونا تعجب کی بات ضرور ہے لیکن بعید نہیں۔ اس جہالت کا مظاہرہ ہم آج بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنے آباء کے بارے اسے بعید از قیاس قرار دینا درست نہ ہوگا۔

گردونواح کے وحشی اور جنگجو گروہ جب اس تہذیب کی محافظ جغرافیائی رکاوٹوں کو عبور کرنے کے قابل ہوئے تو یہ تہذیب انہیں سمجھنے سے عاری اور مقابلہ کرنے میں بے بس نکلی، کیونکہ اشتراک و معاونت کے ماحول کی پیداوار مقابلہ و مسابقت کے ماحول کا سامنا شعوری برتری کے بغیر نہیں کرسکتی۔ ان حملہ آوروں کے ہاتھوں یہ تہذیب برباد ہوئی۔ آریا آئے اور انہوں نے اپنا طبقاتی سماجی و معاشی نظام نافذ کیا۔ یہ سلسلہ تاریخ کے مدو جذر سے گزرتا ہوا رواں دواں رہا۔ ایک طرف امن و آشتی کی یہ دھرتی جنگ ناموں کا موضوع بن گئی۔ دوسری طرف اس سماج نے ہزاروں سالوں تک لوٹ مار اور زبردستی کا شکار رہنے کے باوجود ٹوٹی ہوئی شکل میں اپنی اشتراکی سماجی قدروں اور نفسیات کو قائم رکھا۔ اس کی طاقتور باقیات آج بھی ہمارے سماج میں موجود ہیں۔ جن کا قلع قمع کرنے کیلئے سامراجی طاقتیں اور ان کا کاسہ لیس حکمران طبقہ عوام کے خلاف ہمہ جہت جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہاں کے عوام کو نہ تو معاہدہ عمرانی کا قائل کیا جاسکا ہے اور نہ ہی ریاست کے تقدس کا۔

تاریخ نے اس قوم کو ایک موقع فراہم کیا ہے۔ مذہب کے نام پر ہی سہی ہمیں کم وبیش اپنی جغرافیائی حدود کے اندر ایک ریاست میسر آ گئی ہے۔ اس موقع کو غنیمت جاننا چاہیے۔ اس ریاست کے خلاف داخلی اور خارجی سازشوں کو ناکام کرنا چاہیے۔ وادی سندھ کے ناقابل تقسیم قدرتی وسائل رزق پر انحصار کرنے والے اس خطہ کے باسیوں کو ایک ناقابل تقسیم قوم کے طور پر آگے بڑھنا ہوگا۔ جدید آلات پیداوار، وسائل رزق کی تنظیم نو اور وسیع تر اشتراک کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اس تضاد کو پورا کیے بغیر خود کفالت اور خود انحصاری

ممکن نہیں۔ جس کے بغیر خود مختار قوم اور ریاست کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں اپنی قدیم اشتراکیت کو جدید بنیادوں پر اپنے زمینی حقائق اور عالمی صورتحال کے تناظر میں متحارب مقابلہ مسابقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منظّم کرنا ہوگا۔ ہمارا اشتراکی سوسائٹی کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ شاید یہ قبل از وقت تھا یا ہم شعوری سطح کے حوالہ سے اس اہل نہ تھے۔

طبقاتی ریاست بقول مارکس حکمران طبقہ کا ایک ہتھیار رہوتی ہے۔ ہمیں اشتراکی ریاست قائم کرنا ہوگی۔ گو اشتراکی اقتدار اور نفسیات کو ریاست جو کہ بہرحال جبر کا ایک ادارہ ہوتا ہے راس نہیں آتی لیکن حالات کا تقاضا ہے کہ ریاست کے ادارے کو قبول کیا جائے۔ طبقاتی یا مقابلہ و مسابقت کے سماج کے خاتمہ تک طبقاتی ریاست کے متوازی اشتراکی ریاست کا وجود لازمی بدی بن گیا ہے۔ اسے عوامی جمہوری ریاست کے طور پر تشکیل دیا جائے۔ اس کو سیکولرائز کیا جائے۔ اشتمالی سوسائٹی اور انسانی ایسوسی ایشن کی منزل ابھی نہیں آئی۔

مذہب، ملت، رنگ ونسل اور زبان وثقافت کے حقوق اور آزادیاں وادئ سندھ کی جغرافیائی بنیاد پر قوم کی تشکیل اور وسائل رزق کے اشتراک میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ یہ رنگارنگی ملک وقوم کا حسن ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونا اور اس سے پیار کرنا چاہیے۔ اگر اس حسین امتزاج کو تعصب بنادیا جائے تو ہماری تاریخ کے یہ حسین امین ہمارے خلاف اغیار کے کارگر ہتھیار بن جاتے ہیں۔ نفرتوں، جنگوں اور تقسیم در تقسیم کی مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ تقسیم کے نتیجہ میں زرعی پیداوار کیلئے پانی ایک کے پاس ہوگا اور زرخیز مٹی دوسرے ملک میں، صنعت میں توانائی اور ایندھن ایک طرف ہوگا، خام مال دوسری طرف اور محنت تیسری جانب، تجارت میں کھپت ایک طرف، پیداوار دوسری طرف اور راستہ تیسرے کے قبضہ میں، نتیجتاً سب بے حال ہونگے سب کو بے حال کرنے کی آزادی کسی کو

نہیں دی جاسکتی۔

لہٰذا ہمیں قوم اور ریاست کی بنیاد صرف اور صرف وادیٔ سندھ کی جغرافیائی وحدت پر رکھنا ہوگی۔ ہمیں سارک کو زیادہ فعال بنانے اور ایک دوسرے کے قریب تر لانے میں کردار ادا کرنا ہوگا۔ شنگھائی آرگنائزیشن، آسیان، عرب لیگ، اوپیک اور او آئی سی سے تمام ممکن شعبوں میں تعاون کو فروغ دینے اور سامراجی ممالک پر انحصار ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں اس خطہ کے تمام لوگوں کی فلاح ہے۔ تقسیم کرو، لڑاؤ اور حکومت کرو کی بجائے متحد اور منظّم ہو کر اشتراک و معاونت سے آگے بڑھو ہی ہمارا راہنما اصول ہے۔

# قومی سوال

(یہ تحریر پاکستان مزدور کسان پارٹی کی بنیادی دستاویز قومی کانگریس منظور شدہ ۱۹۹۰ سے لی گئی ہے)

آج پاکستان سمیت تمام ترقی پذیر ملکوں میں دو متضاد عمل بیک وقت جاری ہیں ایک جانب بین الاقوامی سرمایہ ان ممالک کو بین الاقوامی منڈی میں گھسیٹ کر ان کی محنت اور منڈی دونوں کو بین الاقوامی بنا رہا ہے اور دوسری جانب ان ممالک میں تنگ نظر، متعصب، علاقائی و قومی تحریکوں کا زور شور بڑھ رہا ہے۔

ایک جانب بین الاقوامی سرمائے کے ساتھ اشتراک کر کے پاکستان کے سرمایہ دار پاکستان کے محنت کشوں کی پیدا کردہ قدرِ زائد کو بین الاقوامی سرمائے کے قدموں میں ڈالتے نظر آتے ہیں دوسری جانب سامراج کے خلاف یہاں کے لوگوں کی بڑھتی ہوئی تحریک کو کمزور کرنے کیلئے سامراج یہاں مرکز مخالف تحریکوں کو آگے بڑھا رہا ہے۔ سامراج یعنی بین الاقوامی سرمائے کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اپنے لیے ترقی پذیر ملکوں کی سرحدوں کی

رکاوٹوں کو گرائے اور اپنی آزادانہ آمدورفت کیلئے راستہ ہموار کرے۔ بین الاقوامی سرمائے کی قوتوں کو مجتمع اور مرتکز کرنے کیلئے امریکہ اور کینیڈا کو واحد منڈی میں تبدیل کرے۔ یورپی فیڈریشن کا قیام عمل میں لائے اور ایشیا پیسفیک زون کی تشکیل کیلئے کوشاں ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ سامراج کیلئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کے سرمائے کو کمزور کرے۔ مجتمع اور متحد نہ ہونے دے، ان ملکوں کے مابین تضادات اور ٹکراؤ کو بڑھائے اور ہر ملک کے اندر بھی مزید انتظامی، دستوری اور جغرافیائی سرحدوں کو جنم دے کر سرمائے کو منتشر کرے کیونکہ ترقی پذیر ملکوں کا سرمایہ جس قدر مضبوط، مجتمع اور وسیع ہوگا اسی قدر اس میں محنت کشوں کی پیدا کردہ قدر زائد کی لوٹ کھسوٹ اور بندر بانٹ میں زیادہ حصہ طلب کرنے کا رجحان پیدا ہوگا۔ یہی ترقی پذیر ملکوں کے سرمائے کا سامراج دشمن رخ ہے جو عملی شکل اختیار کر نہیں پاتا۔ پاکستان کی جدید نوآبادیاتی ریاست طبقاتی استحصال کے ساتھ قومی جبر بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

چنانچہ پاکستان میں مرکز مخالف تحریکیں روز بروز زیادہ بیباک اور غضبناک ہوتی جاتی ہیں اور ہمارے ملک کے سرمایہ دار، جاگیردار، قبائلی سردار، پیر اور سول ملٹری افسر شاہی کے رنگا رنگ حلقے جارحانہ قومیت پرستی کا شدومد سے پرچار کر رہے ہیں۔ ان کے دباؤ میں لبرل بورژوازی بھی موقعہ پرستانہ انداز سے تنگ نظر قوم پرستی کو مراعات دے رہی ہے۔ متوسط طبقوں اور خود جمہوری اور اشتراکی تحریک کے اندر تنگ نظر قوم پرستی نے دراڑیں ڈال کر اس کو مجبور اور بے بس کر دیا ہے۔ قوم پرست جمہوریت پسند اور قوم پرست اشتراکی مرحلہ وار جدوجہد کے موقعہ پرستانہ نظریے کے تحت پہلے قومی جدوجہد اور بعد میں جمہوری اور اشتراکی جدوجہد کی آڑ میں جمہوری اور اشتراکی جدوجہد کو منتشر اور کمزور کرنے میں

مصروف ہیں اور ڈھٹائی کے ساتھ سامراج سرمایہ داری اور آمریت کی قوتوں کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ ہیں۔ایسی صورت حال میں ضروری ہے کہ قومی سوال پر مزدور طبقے کا نقطہ نظر صاف صاف رکھا جائے۔

محنت کشوں کا نظریہ بین الاقوامی ہے اور تمام انسانوں کی بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہے اور ان تمام نظریوں اور جبر و استحصال پر مبنی ان تمام حیلوں اور چالوں کو حقارت اور نفرت سے رد کرتا ہے جو انسانوں کے درمیان علاقائی، قومی، نسلی، لسانی، ثقافتی، جنسی، مذہبی اور دیگر رجعتی اور انقلاب دشمن تعصّبات کو بڑھا کر مکمل جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے محنت کشوں کی بین الاقوامی جدو جہد میں اختلاف و احتراق ڈال کر اسے کمزور اور غیر موثر کرنے کے درپے ہے۔

محنت کش طبقہ نہ صرف بھانت بھانت کے ان تعصّبات کو رد کرتا ہے بلکہ ان کے خلاف شد و مد سے عملی جدوجہد کرتا ہے چنانچہ کسی بھی ملک میں محنت کشوں کی انقلابی جماعت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ملک کے اندر تمام قومیتوں کے محنت کشوں کو باہم جوڑتے ہوئے انہیں سرمایہ دارانہ استحصال اور جبر کے خلاف محنت کشوں کی بین الاقوامی جدوجہد کے دھارے میں شامل کر کے بین الاقوامی اشتراکیت کے اعلیٰ آدرش کیلئے کمربستہ کرے۔

محنت کشوں کے نظریے کی بین الاقوامیت کوئی روحانی، اخلاقی، تصوراتی، موضوعی خواب پرستانہ فریضہ نہیں ہے بلکہ اس کی ٹھوس تاریخی مادی بنیادیں ہیں۔یہ بین الاقوامیت انسانیت کے تاریخی تجربے کا نچوڑ ہے۔انسان نے جب سے خود کفالت پر مبنی فطری معیشت کی پسماندگی چھوڑ کر تقسیم کار کا طریقہ اپنایا ہے پیداوار اور تبادلہ پیداوار کے عمل نے مسلسل خاندان، برادری، ذات پات، مذہب، قبیلہ، نسل، زبان، ثقافت اور قوم کی نظریاتی اور

علاقائی سرحدوں کو مسمار کرتے ہوئے انسانیت کے وسیع سے وسیع تر اور وسیع ترین علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔اس تاریخی عمل کے دوران نہ جانے کتنے بت ٹوٹے، کتنے خداؤں کی بے حرمتی ہوئی۔لیکن یہ بھنور مسلسل اپنا گھیرا بڑھاتی رہی اور اس کے گھماؤ کی رفتار بھی بڑھتی رہی حتیٰ کہ آج یہ عمل بین الاقوامی سرمائے کی زیر قیادت حقیقی معنوں میں واقعتاً بین الاقوامی ہو چکا ہے۔

آج بین الاقوامی سرمایہ اس دھرتی کے دور دراز علاقوں، دشوار گذار جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں میں گھری ہوئی آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ یہ سرمایہ ہی ہے جس نے آج ان محنت کشوں کو دھکیل کر سات سمندر پار در در کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا ہے۔جن کے آباؤ اجداد کے لئے سامنے کا پہاڑ دنیا کا آخری سرا تھا وہ جن کے نزدیک سمندر پار جانا پاپ تھا آج رضا کارانہ طور پر خود پیسے دے کر اپنی محنت فروخت کرنے کیلئے براعظم پھلانگتے پھر رہے ہیں۔محنت کی اس بین الاقوامی منڈی میں محنت کش کی قومیت،نسل، مذہب اور ثقافت کی کوئی قدر و منزلت نہیں،کوئی پوچھ گچھ نہیں، وہ محض اپنی قوت محنت اپنے ہاتھوں میں لیے دردر پر حاضری دیتا ہے اور اپنی قوت محنت فروخت کرتے وقت نہ تو وہ سرمایہ دار کی قومیت کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی اس کی قومیت سرمایہ دار کے بھاؤ تاؤ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وہ مادی بنیاد ہے جس کے باعث محنت کش طبقہ بین الاقوامی بن جاتا ہے اور بین الاقوامی سرمائے کے بین الاقوامی استحصال کے خلاف محنت کشوں کی متحدہ بین الاقوامی جدوجہد محنت کشوں کا فریضہ بن جاتی ہے۔

سرمایہ داری نظام جس بین الاقوامیت کو آگے بڑھاتا ہے اس کی بنیاد ہے محنت کا استحصال۔ سرمایہ دار خود اپنے ملک یا قوم کے محنت کشوں کا استحصال کرتا ہوا پروان چڑھتا

ہے اور دوسرے ممالک اور اقوام کے محنت کشوں کا استحصال کرنے کیلئے بین الاقوامیت کا پرچم بلند کرتا ہے اس لیے اس کی بین الاقوامیت استحصالی بین الاقوامیت ہوتی ہے اور لازمی طور پر سامراجی، نوآبادیاتی یا جدید نوآبادیاتی شکلیں اختیار کرتی ہے۔

محنت کش طبقہ سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت کو رد کرتا ہے اور مطلق العانیت، جبر اور استحصال کی روک تھام کیلئے اختیارات کی مرکزیت کو توڑنے کے تمام منشوروں، پروگراموں اور مطالبوں کی حمایت کرتا ہے خواہ عدم ارتکاز کا مطالبہ کرنے والوں کے ذاتی یا طبقاتی اوصاف کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ عدم ارتکاز کے مطالبے کو جمہوری ترقی پسند بنیاد کی شناخت کرتے ہوئے اس کی غیر مشروط حمایت کرتا ہے۔ وہ صوبوں، ڈویژنوں، ضلعوں، تحصیلوں ٹاؤن کمیٹیوں اور تمام چھوٹے اداروں کے حقوق و اختیارات پر مرکز کے غاصبانہ تسلط کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور اسی طرح محنت کش طبقہ قوموں کے حق خوداختیاری کی بھرپور حمایت کرتا ہے۔ اس طرح اس کی بین الاقوامیت سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت سے الگ ہو جاتی ہے۔

محنت کش طبقہ کی بین الاقوامیت قوموں کے رضا کارانہ اشتراک اور رضا کارانہ علیحدگی پر اپنی بنیاد رکھتی ہے اور حقِ علیحدگی ہی قوموں کے رضا کارانہ اشتراک کی واحد ضمانت ہے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ محنت کش طبقہ علیحدگی کی ہر تحریک کی حمایت کرے گا۔ جس طرح عورت کے حق طلاق کے ہر حامی پر یہ فرض عائد نہیں ہوجاتا کہ وہ ہر انفرادی عورت کے ہر مخصوص مطالبہ طلاق کی حمایت کرے گا۔ محنت کش طبقہ محض حق علیحدگی کی حمایت کرتا ہے اور علیحدگی کے مختلف مطالبوں پر اپنے آزادانہ موقف اختیار کرنے کا حق برقرار رکھتا ہے۔

محنت کش طبقہ بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہے اور اس لیے وہ جبر پر قائم بین الاقوامیت کو رد کرتا ہے اور قوموں کے رضا کارانہ اشتراک کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے وہ مختلف قوموں کے محنت کش طبقوں کو متحد کر کے انہیں ایک بین الاقوامی تنظیم میں جوڑتا ہے۔اسی بین الاقوامیت اور اس کی نمائندہ جماعت کے حوالے سے جابر قوم کے محنت کش مظلوم قوم پر جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور مظلوم قوم کا محنت کش طبقہ جابر قوم کے حکمران طبقوں کے جبر کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے وہاں کے محنت کش طبقے کے خلاف زہر نہیں اگلتا بلکہ ان کے خلاف یک جہتی کا اظہار کرتا ہے۔

پاکستان میں سرمایہ داروں کے انتہائیطا قتور گروہ اپنی ما قبل سرمایہ دارانہ، مذہبی اور نیم مذہبی و نسلی گروہ بندیوں کی بنیاد پر ہی قائم تھے اس سرمائے نے پاکستان کے طول و عرض میں پھیلتے ہوئے کاروبار کو پاکستانی قومیت اور مسلم قومیت کی چھتری فراہم کی اور سرمائے کی اندرونی کشمکش کیلئے دلی سوداگر، چنیوٹی، میمن، گجراتی وغیرہ برادریاں مطلوبہ تقاضے پورے کرتی رہیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پنجاب میں نئے سرمائے کی افزائش کے بعد اس نئے سرمائے نے چنیوٹی اور دیگر پنجابی سرمایوں کے ساتھ مل کر پاکستانی قومیت کو اغواء کرلیا۔ سندھ اور پختون علاقوں میں ابھرنے والے تیزی سے بڑھتے ہوئے سرمائے نے اپنے مخصوص تاریخی، اقتصادی و سماجی حوالوں سے اپنی اپنی قوم تشخیص کرلی ان سرمایوں کی کشمکش ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوگئی کہ محض برادریوں کے بل پر اس کشمکش میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا ممکن نہ رہا۔سرمایہ داروں کے چند بڑے گروہوں سے پاکستانی قومیت بھی چھن چکی تھی اور ان کے پاس اپنی قوم بھی نہ تھی چنانچہ مہاجر قوم میں ان کو اپنی قوم دستیاب ہوگئی۔

پاکستان کے مزید علاقوں میں بھی سرمایہ داری رشتے اور سرمایہ بڑھ رہا ہے یہ سرمائے بھی یقیناً محنت منڈی اور وسائل کیلئے سرمایوں کی کشمکش کے تقاضے پورے کرنے کیلئے اپنی قوم کی تلاش میں ہوں گے اگر موجود سرمایوں نے انہیں اپنی اقوام میں جگہ نہ دی تو یہ بھی یقیناً اپنے تاریخی سماجی واقتصادی حالات کی مطابقت سے اپنی موزوں حال قومیت کھوج لیں گے۔ سرائیکی قومیت اور گلگتی قومیت اسی عمل کے نتیجے میں روز افزوں طور پر حقیقت پذیر ہو رہی ہے۔ یوں ان عملوں کے نتیجے میں پاکستانی ریاست میں پاکستانی قومیت اور مسلم قومیت اور چار یا چھ قومیتوں کے علاوہ مزید قومیتیں اس چومکھی جنگ میں شریک ہو جائیں گی اور قومی مسئلہ کو پاکستان کا اہم ترین سیاسی مسئلہ بنانے میں اپنا کردار ادا کرنے لگیں گی۔

مزدور طبقہ پاکستانی سرمائے سمیت تمام سرمایوں کے مسئلے کو بیک وقت اٹھاتا ہے وہ کسی ایک سرمائے کے دوسرے سرمایوں کے خلاف مطالبات کو نہیں اٹھاتا وہ مخصوص سرمایہ دارانہ انداز میں اٹھائے ہوئے قومی مسئلہ کو کلی طور پر رد کرتا ہے اور اس کے برعکس اپنا قومی پروگرام دیتا ہے۔ جس کی بنیاد قوموں کے رضا کارانہ اشتراک اور رضا کارانہ علیحدگی پر ہے وہ قوموں کے حق خود اختیاری بشمول حق علیحدگی کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ تمام سرمائے باہمی مخاصمت کے باوجود مخصوص سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت کی جانب رواں دواں ہیں۔ چنانچہ کسی ایک قومی سرمائے کے اٹھائے ہوئے قومی مسئلہ کی حمایت کر کے وہ اس قومی سرمائے کو مضبوط کرنے چاروں طرف پاؤں پھیلانے اور سرمائے کے بین الاقوامی اتحاد میں شامل ہونے میں ہی مددگار ہوگا اور اس عمل کے دوران وہ خود اپنے طبقے کے بین الاقوامی اتحاد کو شدید نقصان پہنچانے کا باعث بنے گا۔

پاکستان میں سرمایہ داری سامراج کے زیرِ سایہ پروان چڑھی ہے اور پاکستانی سرمایہ دار مکمل طور پر سامراج کا حاشیہ نشین اور اس کا دلال ہے۔ پاکستان میں سرمایہ دارانہ استحصال کے وسائل امداد، قرض، مشینری، تجارتی کوٹہ وغیرہ کا زیادہ حصہ سامراج ہی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ دیگر وسائل کی طرح ان وسائل پر دسترس کے لیے بھی مختلف سرمایوں میں کشمکش ہوتی ہے تاہم یہ تمام سرمائے عالمی سامراج کے بارے میں اپنے رویوں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور سبھی سامراج دوست ہیں۔

جدید ترین اعداد و شمار کے مطابق ترقی پذیر ممالک کی قدر زائد کا ۹۰ فیصد حصہ سامراج لے اڑتا ہے اور ان ملکوں کو دس فیصد ہی ہاتھ آتا ہے۔ پاکستان میں پاکستانی سرمائے اور دیگر قومی سرمایوں کی چومکھی لڑائی میں اسی دس فیصد کے بٹوارے پر جھگڑا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اس ۹۰ فیصد کے لئے جنگ کرنے کیلئے تیار نہیں جو سامراج لے جاتا ہے۔ اسی سامراجی استحصال کے نتیجے میں ملکی معیشت پر جو بوجھ پڑتا ہے اس کو پاکستان کے محنت کش عوام کے کاندھوں پر منتقل کرنے کیلئے سارے سرمائے، پاکستانی سرمایہ اور دیگر قومی سرمائے تمام کے تمام متحد و متفق ہیں۔

ملکی سیاسی جماعتیں ایک جانب سامراج کے ساتھ پاکستانی سرمائے کے رشتوں اور دوسری جانب پاکستانی عوام کی سامراج دشمنی کے درمیان پھنسے ہوئے اور دونوں کی سرپرستی اور حمایت کی خواہش کی وجہ سے سامراج کے مسئلہ پر اپنے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر مبہم آوازیں نکالتی رہتی ہیں۔

پاکستان کے مختلف سرمایوں کو پہلے اور بعد والا مرحلہ وار جدوجہد کا موقعہ پرستانہ نظریہ بہت موزوں لگتا ہے۔ اس کا نعرہ ہے پہلے قومی جدوجہد بعد میں سامراج دشمن

جدوجہد اس قسم کا نعرہ محنت کش طبقے کی بے پناہ توانائی کو مختلف سرمایوں کی بے لگام خواہشات کے تابع کردیتا ہے۔

بورژوا نظریہ سازوں نے سامراج دشمنی کی دھار کند کرنے کیلئے ایک حربہ یہ استعمال کیا کہ عالمی سامراج کو سامراجوں کے ایک غول میں مخفی کردیا جائے۔ پوری دنیا میں سامراجوں کی ایسی کثرت کردی جائے کہ محنت کشوں کو یہ سمجھ نہ آئے کہ کس کس کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ یہاں تو سبھی سامراجی ہیں اور بکھرے ہوئے اہداف پر حملے میں ان کی توانائی اس قدر ضائع ہوجائے کہ عالمی سامراج بےفکر ہوکر چین کی بنسری بجائے چنانچہ ہمارے پیٹی بورژوا دانشور بھی خود پاکستان کے اندر روز نئے سامراجوں کی تحقیق و دریافت کررہے ہیں اور پنجابی سامراج، مہاجر سامراج، پختون سامراج کی نظریہ سازی کررہے ہیں اور پہلے اور بعد کی مرحلہ وار جدوجہد کا موقعہ پرستانہ حربہ تو ہمیشہ ہی موجود ہے۔ آج سندھی قوم پرستی میں دو رجحانات رفتہ رفتہ مرتب ہورہے ہیں ایک کا نعرہ ہے پہلے مہاجر سامراج سے نمٹا جائے اور دوسرے کا نعرہ ہے پہلے پنجابی و پختون سامراج سے نمٹا جائے لیکن دونوں اس پر متفق ہیں کہ عالمی سامراج کو توجہ کی ضرورت نہیں۔

عالمی سامراج ایک جانب پاکستانی سرمائے سمیت تمام قومی سرمایوں کو علیحدہ علیحدہ سرمائے کے بین الاقوامی انضمام کی جانب گھسیٹ رہا ہے اور ان کے مفاد کو اپنے مفاد سے جوڑ رہا ہے اور دوسری طرف وہ پاکستانی سرمائے اور دیگر قومی سرمایوں کے درمیان کشمکش کو تیز کرتا ہے وہ مخصوص علاقوں اور مخصوص صنعتوں کیلئے پابند قرضے دے کر ان کی کشمکش کو بڑھاتا ہے تاکہ انفرادی طور پر کوئی بھی سرمایہ سرمائے کے عالمی انضمام کی رفتار کو سست نہ کرسکے۔ سامراجی سرمائے پاکستانی سرمائے اور قومی سرمایوں کے باہمی ربط و تصادم

کی یہ مجموعیت ہی پاکستانی ریاست میں سرمائے کے چلن کو متعین کرتی ہے۔محنت کش طبقے کے سامنے یہ سارے سرمائے ایک اٹوٹ کل کے طور پر سامنے آتے ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان میں سرمایہ داری اور آمریت میں گہرا رشتہ ہے ۔مزدور طبقہ تمام مسئلے ایک ساتھ اٹھاتا ہےاور سرمایہ داری، آمریت اور قومی جبر کے خاتمے کے لیے اپنا پروگرام پیش کرتا ہے وہ پہلے اور بعد کی موقعہ پرستی کو رد کرتے ہوئے بیک وقت سوشلسٹ معیشت مکمل سیاسی و سماجی جمہوریت، عالمی سرمایہ دارانہ سامراجی استحصال کے خاتمے اور قوموں کے حق علیحدگی کی حتمی ضمانت کے ساتھ ان کے رضا کارانہ اشتراک اور بین الاقوامیت کا پرچم بلند کرتا ہے۔

مزدور طبقہ پرامن رضا کارانہ بین الاقوامیت کے اصولی موقف کے پس منظر میں پاکستان اور جنوبی ایشیا کے تمام ممالک میں پیچ در پیچ قومی مسئلے کا جائزہ لیتا ہے اور اسے حل کرنے کے تمام سطحی جزوی اور مصنوعی فارمولوں کو رد کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے کسی ملک کا قومی مسئلہ محض اس ملک تک محدود نہیں ہے پنجاب، کشمیر، بنگال کا قومی مسئلہ ہو یا بلوچ، پشتون، تامل قوم کا قومی مسئلہ ہو یا نیپال سے بنگال آ کر آباد ہونے والے گورکھوں، یوپی ، بہار ، دلی وغیرہ سے آ کر سندھ میں آباد ہونے والے مہاجروں اور سندھ سے ہندوستان جا کر آباد ہونے والے سندھیوں کا قومی مسئلہ ہو یا پھر اروناچل پردیش اور بنگلہ دیش کے " آدی باسیوں" کا مسئلہ ہو اسے محض ایک ملک کی حد تک رکھ کر حل نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کون سی قوم کس ریاست میں رہنا چاہتی ہے یا نہیں رہنا چاہتی اسے حتمی طور پر طے شدہ امر کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔مزدور طبقہ تاریخی تسلسل میں نئی قومی تشکیلات کے ابھرنے کے عمل کو جبراً روکنے کے ہر قدم کو رد کرتا ہے ۔ وہ قوموں کے حق خودارادی کے

آفاقی اصول کے تحت جنوبی ایشیا کی تمام قوموں کے حق علیحدگی کو تسلیم کرنے اور رضا کارانہ علیحدگی کو عمل میں لانے کا آئینی طریق کار طے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ جنوبی ایشیا کی قومیں مشترکہ تاریخی، لسانی، ثقافتی پس منظر رکھتی ہیں اور ان کے اقتصادی مسائل باہمی انحصار کا تقاضا کرتے ہیں بندرگاہوں کا مسئلہ ہو یا دریاؤں کے پانی کی تقسیم اور سیلابوں کی روک تھام کا مسئلہ ہو، فوجی نفری کو گھٹانے کا مسئلہ ہو یا اقتصادی وسائل اور تقسیم کار کا سوال ہو یا پھر ٹیکنالوجی میں تیز رفتار پیش رفت کے ذریعے سامراجی استحصال سے نجات کا مسئلہ ہو اس نہج کے تمام مسائل جنوبی ایشیا کی تمام قوموں کی مشترکہ مساعی اور اتحادِ عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔

# انسان کی خوش فہمی

## (OPTIMISM OF MAN)

یہ مغالطہ ہے کہ ایک ہی مذہب، زبان، ثقافت، علاقے یا قومیت سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرتے۔ تاریخ ایسی بہت سی مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں ایک مذہب، زبان، ثقافت، علاقے اور قومیت کے لوگوں نے نہ صرف باہم جنگیں لڑیں اور انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کی بدترین مثالیں قائم کیں۔ سب سے پہلے ہم مذہب کی بات کرتے ہیں کیونکہ تمام مذاہب اپنے پیروکاروں کے درمیان بھائی چارے اور محبت کا پرچار کرتے ہیں لیکن مذہبی تعلیمات کے برعکس ایک ہی مذہب کے ماننے والوں نے مذہبی معاملات میں اُجارہ داری اور برتری کیلئے خطرناک جنگیں لڑیں۔ عیسائیت دعوی کرتی ہے کہ تمام عیسائی آپس میں بھائی بھائی ہیں لیکن ہم نے پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک کے درمیان فرقہ وارانہ جنگیں دیکھی۔ کوئن میری کے دور میں دس ہزار پروٹسٹنٹ زندہ جلا دیئے گئے۔ کوئن الزبتھ کے دور میں ہزاروں کیتھولکس کو پریشان کیا گیا۔ ان ریاستوں میں جہاں

یونانی آرتھوڈکس چرچ پااثر تھا۔غیر آرتھوڈکس لوگوں کا جینا حرام کر دیا گیااوراُن کے بنیادی حقوق غضب کئے گئے۔جان کالون پروسٹنٹ ازم کا بڑا علمبردار تھا،اُس نے کچھ کیتھولکس کو سوئٹزرلینڈ میں زندہ جلوادیا۔ان تمام صورتوں میں ظلم کرنے اورسہنے والے دونوں عیسائی تھے۔

اسلامی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار خلیفاؤں میں سے تین کوشہید کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ جیسی بااثر شخصیات نے حنین،سفین اور جمل جیسی خوفناک جنگیں باہم لڑیں۔جن میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔یزید کی حکومت نے نواسۂ رسول حضرت امام حسینؓ کوشہید کر دیا۔جب ابوالعباس حکومت میں آیا تو اس نے بنوامیّہ کے لوگوں کو مروایا۔عمر بن عبدالعزیز کے جسم کو قبر کھود کر نکالا گیا اور بے حرمتی کی گئی۔ہندوستان میں مرزا حکیم اپنے بھائی شہنشاہ اکبر کے ہاتھوں مارے گئے اور ہمایوں بادشاہ نے اپنے تینوں بھائی ہندال،عسکری اور کرمان کو مروادیا۔اورنگزیب نے اپنے باپ شاہ جہاں کو زنداں میں ڈلوادیا،جبکہ اپنے بھائی دارشکوہ کو جواُس وقت کے قانون کے مطابق بادشاہ بننے کا صحیح حقدار تھا،قتل کروادیا۔علاؤالدین خلجی نے اپنے چچا کو جواُسکا سسّر بھی تھا،ہاتھی کے پیروں تلے کچلوادیا۔کچھ مئورخوں کے مطابق اُس نے اپنے چچا کو گلے لگایا اور پھراس کے پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ملکہ رضیہ سلطانہ اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں قتل کروادی گئی۔ان تمام واقعات میں قاتل اور مقتول دونوں ہی مسلمان تھے۔

جدید ہندوستان میں ہر سال دس ہزار شادی شدہ عورتوں کو جہیز نہ لانے پر جلا کر ماردیا جاتا ہے۔ملک کے کئی حصوں میں نچلی ذات کے ہندوؤں کی تذلیل کی جاتی ہے،اور اکثر قتل کر دیا جاتا ہے۔اس ظلم کا نشانہ بننے اور بنانے والے دونوں ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں۔لہٰذا مذہب کو یکجہتی کی علامت نہیں سمجھا جاسکتا۔

آج ہمارے مذہبی علماء حتیٰ کہ سیاسی شخصیات بھی امریکہ کے مختلف ملکوں کے حملوں کو اسلام کے خلاف حملہ قرار دیتی ہیں، جبکہ انہیں جان لینا چاہئے کہ امریکہ ایک سامراج (Imperialist) ہے، جس کی دوستی اور دشمنی صرف اپنے مفادات کے تحت ہوتی ہے، اگر امریکہ صرف مسلمانوں ہی کا دشمن ہے تو اس نے ویت نام، کوریا، ہیٹی، کیوبا اور دیگر غیر مسلم ممالک میں کیوں حملے کئے اور لاکھوں لوگوں کو کیوں ہلاک کیا۔ آج ہمارے علماء ہمیں بتاتے ہیں کہ امریکہ ایک عیسائی ریاست ہے اور وہ دنیا بھر میں عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے مسلم ممالک پر حملے کر رہی ہے، اُن کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ انڈونیشیا ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انڈونیشیا کے ایک جزیرے ایسٹ تیمور میں اکثریت عیسائیوں کی تھی، جب وہاں (ایسٹ تیمور) کے لوگوں نے انڈونیشیا سے علیحدگی کی تحریک چلائی تو اُسے کچلنے کے لئے امریکہ نے اُس وقت کے امریکی حمایت یافتہ انڈونیشین ڈکٹیٹر جنرل سوہارتو کو فوجی امداد (اسلحہ جات) اور تربیت دی، تاکہ وہ ڈکٹیٹر وہ ایسٹ تیمور کے عیسائیوں کو کچل سکے۔ امریکہ کا یہ کردار ایک عیسائی ریاست کا نہ تھا کہ وہ ایسٹ تیمور کے عیسائیوں کے مارنے کے لئے اپنے وسائل مسلمانوں (انڈونیشین) کو دے، لیکن امریکہ نے ایسا کیا۔ درحقیقت امریکہ کو انڈونیشیا کے ڈکٹیٹر جنرل سوہارتو کی حمایت درکار تھی اس لئے امریکہ نے ایسٹ تیمور کے لوگوں کو کچلنے کے لئے اپنے وسائل فراہم کر دیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سامراج کو اگر اپنے مفادات پر ضرب پڑتی ہو تو وہ مذہب، رنگ، زبان اور دوسرے اختلافات کو ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اُسے (سامراج) کو صرف اپنے مفادات ہی عزیز ہوتے ہیں۔

مذہب بھی اور دوسری چیزوں کی طرح تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ دور میں اسلام قبول کرنے والے سفید فاموں کے بارے میں اُنکے آباؤ اجداد نے

کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ اُنکی اولادیں مذہب تبدیل کرلیں گے۔لیکن اب ایسا ہو رہا ہے۔ یہی بات ان ملین بھر مسلمانوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے،جنہوں نے چند سو سال پہلے مذہبِ اسلام قبول کیا۔انسان کو مذہب کے نام پر بیوقوف بنایا جاتا ہے۔

لیکن ہمیں اُن سندھی ہاریوں کو نہیں بھولنا چاہیے جو سندھی وڈیروں اور زمینداروں کی نجی جیلوں میں قید ہیں۔قیدی اور قید کرنے والے دونوں سندھی ہیں۔پنجاب میں جاگیردار اور اُن کے غنڈے جو غریب کسانوں،مزارعوں کی بیٹیوں کی بے حرمتی کرتے ہیں وہ بھی پنجابی ہیں اور اُس ظلم کا نشانہ بننے والوں کی بھی یہی قومیت (پنجابی) ہوتی ہے۔ بلوچستان اور سرحد میں وہ قبائلی سردار جو اپنے علاقوں میں ہسپتال بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔وہ بھی بلوچ اور پختون ہیں اور علاج و معالج کی سہولیات نہ ہونے کے باعث مرنے والے بھی اُنہیں کی قوم میں سے ہوتے ہیں۔یہ مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر تمام سندھی آپس میں بھائی ہیں تو ڈیفنس میں رہائش پذیر اور گوٹھوں اور کچی بستیوں میں رہنے والے سندھیوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کلفٹن اور بنارس چوک میں رہنے والے پٹھانوں یا ڈیفنس اور اعظم بستی کے پنجابیوں یا سوسائٹی اور لالوکھیت اور نیو کراچی میں رہنے والے مہاجروں کے درمیان فرق کیوں ہے؟ پھر یہ سوال ہے کہ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو دعوی کرتا ہو کہ اُسکی قوم بالکل خالص ہے اور اُس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔مثلاً اگر ایک سندھی ایسا کہتا ہے تو یہ بات کنفیوژ کرتی ہے کیونکہ ہم سندھ میں اور پاکستان کے دوسرے حصوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے کئی حصوں میں بڑی دلچسپ صورتحال دیکھتے ہیں۔سندھ کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ہی دیکھئے،جن کا تعلق افغانستان سے تھا۔اسی طرح سچّل سرمست، فارس (ایران) سے تعلق رکھتے تھے۔میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انہیں افغانی

کہوں یا فارسی یا پھر سندھی۔ بہت سارے سندھی تاریخی طور پر بلوچ بھی ہیں۔ مثلاً رند، چانڈیو، مگسی، لاشاری، جتوئی، زرداری، جام، بجارانی اور دوسرے قبائل بلوچ ہیں۔ سندھ میں رہنے والے جیئے سندھ ترقی پسند کے چیئر مین، سندھی قوم پرست قادر مگسی بھی بلوچ ہیں۔ سندھ کے کچھ حصوں میں رہنے والے ڈرانی پختون ہیں۔ سندھی قوم پرستی کے سب سے بڑے علمبردار سائیں جی ایم سیّد ہیں لیکن اُنکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنکے آباوٴاجداد بھی عرب علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ سمّا اور دوسرے قبائل خالصتاً سندھی ہیں لیکن وہ خود دوسری طرف یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ وہ اور سندھ کے دوسرے سیّدوں نے عرب علاقوں سے ہجرت کی تھی۔ بابا بلّھے شاہ اور بابا فرید پنجابی اور سرائیکی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن اُنکے آباوٴاجداد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وسطی ایشیاء سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ غالب اور میر تقی میر کٹر اردو پرستوں کے آئیڈیل تو ہو سکتے ہیں لیکن انہوں نے بھی بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح وسطی ایشیاء سے ہندوستان ہجرت کی۔ اسی طرح اردو کے بہت سے شاعر اور ناول نگار نہ تو اردو اسپیکنگ تھے نہ ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، جالب، گلزار اور سعادت حسن منٹو، مستنصر حسین تارڑ، احمد فراز، اشفاق احمد اور بہت سے ایسے نام ہیں۔

آرٹ میں جن لوگوں نے اردو کی خدمت کی وہ اردو اسپیکنگ نہ تھے، جیسا کہ گانے میں نور جہاں، آشا، جگجیت سنگھ، چترا، انوپ جلوتا، ناہید اختر، لتا، ہاری ہارون، نصرت فتح علی خان اور بہت سے ایسے ہیں جو اردو اسپیکنگ نہ تھے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہو سکتی ہے، اگر ہم زبان کی بنیاد پر لوگوں کی درجہ بندی کریں۔ اس ساری تفصیل کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ کس طرح مختلف زبانوں کے لوگ کسی ثقافت کی ترقی میں

حصّہ لیتے ہیں۔ چنانچہ قوم پرستانہ خطوط پر سوچنا بیکار ہے۔

انگلش ادب میں بھی ہمیں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو انگریز نہیں تھے، لیکن ان کے زبان کی ترقی میں حصّے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جوزف کانریڈ اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ناول انگلش زبان کے لئے ایک سرمایہ ہیں لیکن وہ انگریز نہیں تھے۔ ارون دتی رائے اور بیپسی سدھوا اور بہت سے دوسرے ماڈرن رائٹرز انگریز نہیں ہیں لیکن ان کے ناول اور تحریریں انگلش زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر ایک شخص قوم پرست ہو کر سوچتا ہے اور دوسرے لوگوں کی زبانوں، علاقے، ثقافت اور مذہب کے وجود ہی کو مسترد کرتا تو وہ بھلا کیسے انسانیت کے مشترکہ ورثہ سے لطف اندوز ہونے کا حق رکھتا ہے۔ جن میں سائنسی ایجادات اور آسائشیں، مائیکل اینجلو کی پینٹنگز، میر، غالب، فیض، شیکسپئر، شیلے، ورڈز ورتھ، ٹیگور اور کیٹس کی شاعری جبکہ ٹالسٹائی، گورکی، تھامس ہارڈی، کانریڈ کے ناول اور بہت سی چیزیں شامل ہیں۔

زبان ایک اور جزو ہے جو لوگوں کو غرور اور قوم پرستی کی طرف مائل کرتا ہے۔ ہر قوم یہ دعوی کرتی ہے کہ اُس کی زبان دوسری زبانوں سے برتر ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا کوئی ایسی زبان ہے جو غیر ملاوٹ شدہ ہو یا خالص ہو؟ مثال کے طور پر اگر میں ایک انگریز ہوں اور یہ دعوی کرتا ہوں کہ میری زبان انگریزی غیر ملاوٹ شدہ ہے۔ لیکن انگریزی زبان کے بغور مطالعہ پر پتہ چلے گا کہ یہ زبان دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظوں پر مشتمل ہے مثلاً لاطینی، یونانی، فرانسیسی، عربی حتی کہ اردو اور ہندی تک کے الفاظ لوٹ اور جنتا شامل ہیں۔ انگلش زبان میں دوسری زبانوں سے شامل ہونے والے الفاظ کی موٹی موٹی کتابیں ہیں۔ اسی طرح اگر میں کہوں کہ سندھی میری زبان ہے تو مجھے پتہ چلے گا کہ اس

میں بھی عربی، فارسی، ہندی اور دوسری قدیم زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اگر میں اُردو کو اپنی زبان کہوں تو یہ بھی دوسری زبانوں کی ملاوٹ سے خالی نہیں یہاں تک کہ لفظ اردو بھی اردو سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ تاریخی اعتبار سے ترکی زبان کا ایک لفظ ہے۔ اردو بھی فارسی، ترکی، عربی، انگریزی، ہندی، سنسکرت اور دوسری زبانوں کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ خالصتاً قوم پرستانہ مفہوم میں جو زبان کے خالص اور اصل ہونے کا پروپیگنڈہ کرتا ہے، لہٰذا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اردو میری زبان ہے۔

ملک بھی اتحاد کی علامت نہیں یہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً تین عشرے قبل بنگالی، پاکستانی تھے۔ لیکن اب وہ بنگلہ دیشی ہیں۔ کوئی بھی شخص پاکستانی ہوسکتا ہے لیکن وہ کسی دوسرے ملک چلا جاتا ہے تو ممکن ہے کچھ عرصے کے بعد وہ اس ملک کی شہریت اختیار کرلے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ البرٹ آئن اسٹائن اور بہت سی دوسری عظیم شخصیات امریکی نہیں تھیں۔ لہٰذا قومیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ ہمارا مذہب، ہمارا ملک اور ہماری زبان۔ جو قدر یا خصوصیت نہیں بدلتی وہ یہ ہے کہ ہم انسان تھےاور انسان ہیں اور ہم ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اب ایک سوال یہ اُبھرتا ہے کہ کیا ایک دوسرے کے بغیر ہم اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں یا کہ ہم ایک دوسرے پر کس طرح منحصر ہیں؟ کیا کوئی ایسا ملک ہے جو اپنی ضرورتوں کیلئے دوسرے ممالک کا محتاج نہیں؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جو دوسرے لوگوں کا محتاج نہیں؟

چلیں دیکھتے ہیں کہ ہم کس طرح ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص مردم بیزار بن جاتا ہے اور لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں چاہتا، اس صورتحال میں اُسکے لئے ممکن ہوگا کہ وہ اپنی تمام ضروریات بھی خود پوری کرے۔ کیا وہ خود

گندم اُگا سکتا ہے اور اُسکے پکنے کے لئے چار مہینے انتظار کرسکتا ہے۔ اور کیا وہ اسے خود پیس کر پکا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اُسکی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی کیونکہ وہ گندم کے پکنے کا چار مہینے تک انتظار نہیں کرسکتا۔ وہ فاقوں سے مر جائے گا۔ ایک لمحے کے لئے ہم ان کپڑوں کے بارے میں سوچیں جو وہ مردم بیزار شخص پہنا ہوا ہے۔ یہ کپڑے کسی ٹیکسٹائیل مل میں بنے ہیں، کپڑوں کو بنانے کے لئے کپاس کی ضرورت ہوتی ہے اور کپاس کھیتوں میں اُگتی ہے۔ چنانچہ کسی (کسان) نے کپاس کا بیج بویا ہوگا۔ دوسروں نے اسے چُنا ہوگا۔ کپاس سے دھاگے اور دھاگے سے کپڑے میں تبدیل کیا گیا ہوگا۔ جب کہیں جا کے اسے سیا اور پھر پہنا گیا ہوگا۔ اگر ہم اس پورے مرحلے کو دیکھیں تو ہم نوٹ کریں گے کہ جس نے بیج بویا وہ انسان تھا۔ درحقیقت اس تمام عمل (Process) میں شامل تمام لوگ انسان تھے۔ ہم قومیّتوں، مذاہب، زبان اور علاقے سے ان لوگوں کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ایسا کرنا شروع کر دیں تو ایسا مشکل اور بے فائدہ ہوگا۔ جیسے کہ ہم بحثیت مسلمان اگر یہ طے کرلیں کہ ہم عیسائیوں اور یہودیوں کی بنائی ہوئی اشیاء نہیں خریدیں گے تو ہمیں بہت سی گاڑیوں، ادویات اور بہت سی دوسری ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے ضروری اشیاء سے خود کو محروم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یا تو وہ اشیاء وہ لوگ بنا کے بھیجتے ہیں یا پھر ان اشیاء میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی عیسائی اور یہودی لوگوں نے تحقیق کر کے ایجاد کی ہیں۔ اس مثال کا مقصد یہ ہے کہ ہم درحقیقت ایک دوسرے محتاج ہیں ۔ اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو احساس کمتری یا برتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال اُس وقت اُٹھتا ہے جب A کو B پر تکیہ کرنا ہوتا ہے کیونکہ B وہ دے سکتا ہے جو A کے پاس نہیں ہے لہذا B کو A سے برتر تصور کیا جاسکتا ہے لیکن ایسی صورتحال میں جہاں ہر ایک کو دوسرے پر

انحصار کرنا ہوتا ہے، برتری کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا۔ بہت سی دوسری قوموں کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے اُنکی بدولت ہے۔ایک طویل عرصے تک انگریز لوگ تہذیب کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔فرانسیسی، پرتگالی،عرب،ھسپانوی (اسپینش)، اطالوی (اٹالین) جرمن، روسی اور دوسری بہت سی قومیں بھی ایسے دعوے کرتی رہیں ہیں۔ امریکی تو اب تک یہ دعوے کرتے رہے ہیں۔ایسے دعوے مذہب کی بنیاد پر بھی کیئے گئے ہیں۔مثلاً یہودی سمجھتے ہیں کہ وہ منتخب قوم ہیں۔عیسائیوں کا خیال ہے کہ خدا کی بادشاہت صرف اُنکے لئے ہے، جبکہ مسلمانوں کو بھروسہ ہے کہ جنّت اُن ہی کے لئے بنائی گئی ہے۔ مذاہب کے ماننے والوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ صرف اُن کے مذہب اور اُن کے مذہب کے پیروکاروں نے دنیا کی تہذیب اور ترقی میں کردار ادا کیا ہے۔مثال کے طور پر بہت سے مسلمانانِ پاکستان یہ سمجھتے ہیں کہ آج مغرب کے پاس جو کچھ ہے وہ مسلمانوں (عربوں) کی دین ہے۔مصنف کا بھی یہی خیال تھا جب تک وہ اسکول میں تھا لیکن کالج جانے کے بعد اسے مسلم فلاسفروں، دانشوروں اور سائنسدانوں کے بارے میں پتہ چلا کہ انہوں نے یونانیوں سے بہت کچھ سیکھا۔مثال کے طور پر ابن رُشد، جو کہ ایک عقلی بنیادوں پر سوچنے والا فلسفی تھا۔اُس نے گیارہ سو پچاس کتابیں ارسطو کے مابعد الطبعیات پر لکھیں جبکہ ارسطو مسلمان نہ تھا۔اس کے علاوہ ابن رُشد کے کچھ آئیڈیاز یونانی مادہ پرست فلسفیوں سے کافی ملتے جُلتے تھے۔الفارابی کی کتاب مدینۃ الفضلاء افلاطون کی کتاب ریپبلک سے مماثلت رکھتی ہے۔مسلمان سائنسدانوں اور فلاسفرز نے یونانی فلاسفرز اور سائنسدانوں سے بہت کچھ سیکھا۔جبکہ یونانی تو مسلمان نہ تھے لیکن مسلمانوں نے یونانیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ بہت سارے یونانی فلسفیوں کے خیالات ہندو جوگیوں اور پنڈتوں سے ملتے جلتے تھے،

مثال کے طور پر افلاطون نے جس طرح مثالی معاشرہ کی درجہ بندی تین طبقات میں کی جو بالکل ہندوؤں کے ذات پات کے تصور سے مشابہ ہے۔ ہندومت میں چار ذاتیں ہیں، برہمن (مفکر، دانش ور یا حکمران)، کشتری (جنگجو)، ویش (تاجر یا کسان) اور شودر (کام کرنے والے) جس کو نچلے درجے کے کام کرنا ہوتے ہیں۔ یہ ذاتیں اس مفروضہ پر بنی ہوئی ہیں کہ برہمن کو خدا کے دماغ سے پیدا کیا گیا ہے۔ لہذا انہیں غور وفکر اور تفکر کرنا چاہئے۔ کشتری ذات سے تعلق رکھنے والے لوگ خدا کے ہاتھ سے پیدا کئے گئے ہیں، لہذا نہیں محافظ ہونا چاہئے۔ ویش خدا کے پیٹ سے پیدا کئے گئے ہیں لہذا انہیں کھلانے والا ہونا چاہئے، اور اس کے لئے انہیں اناج اگانے کی ضرورت ہوگی۔ شودر لوگ خدا کی پاوں سے پیدا کئے گئے ہیں لہذا انہیں خدمت گذار ہونا چاہئے، معمولی کام کرنے چاہئے۔ افلاطون کی نظریاتی ریاست میں بھی تین طبقات ہیں کہ خدا نے کچھ لوگوں کی گردنوں میں سونے کا۔ کچھ کے چاندی کا اور کچھ کے تانبہ کا گھیرا رکھا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کی گردن کے گرد سونے کا گھیرا ہے وہ سب سے برتر ہیں۔ چاندی کے گھیرے والے اس طبقہ بندی میں دوسرے نمبر پر جبکہ سب سے آخر میں تانبہ کے گھیرے والے آتے ہیں۔ اُس نے ایک مفروضہ پیش کیا اور اس کے مطابق کچھ لوگ آسانی سے کھانے کی خواہش کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ کچھ لوگوں میں دلیری ہوتی ہے جبکہ کچھ لوگ سیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کو معاشرے میں برتر ہونا چاہئے۔۔ افلاطون کی کتاب ریپبلک کی فلاسفی کے مطابق بہادری اور جرات مندی کے حامل لوگوں کو جنگجو اور وہ لوگ جو کھانے کی خواہش کے زیر اثر آجاتے ہیں انہیں معمولی کام کرنے چاہئے۔ یہ یونان کے غلام ہوتے تھے جو کہ یونانی آبادی کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہیں اور جن کی محنت پر پوری یونانی تہذیب انحصار کرتی تھی۔

ہم افلاطون کی تین طبقات میں معاشرے کی تقسیم کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ہندوؤں کی ذات پات کے نظریہ سے ملتا جلتا ہے۔ اگر چہ کچھ فرق اس میں موجود ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ افلاطون مصر، اٹلی، ہندوستان اور دنیا کے بہت سے دوسرے حصّوں میں گیا اور اس بات کا امکان ہے کہ اس نے یہ چیزیں ہندو معاشرے سے سیکھیں۔ اس کے علاوہ فیثا غورث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تناسخِ ارواح کا نظریہ ہندو فلسفے سے لیا تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ بہت سے یونانیوں بشمول بڑے بڑے فلسفیوں کے ہندوؤں سے بہت کچھ سیکھا۔ اسی طرح ہندوستان کے باسیوں نے بہت سا علم دنیا کے دوسرے علاقوں سے حاصل کیا ہوگا۔ تاریخ میں کوئی ایسی قوم یا عقیدے کے لوگ نہیں ملتے جنھوں نے تنہا سائنس، تہذیب اور دنیا کی ثقافتوں کی ترقی میں کردار ادا کیا ہو، بلکہ اس میں تمام اقوام، مذاہب اور علاقوں کے لوگوں کا حصّہ ہے چنانچہ دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگوں کے کردار کو مانا جائے، بجائے اسکے کہ کسی ایک مذہب یا قوم کے کردار کو فخر سے بیان کریں۔ چنانچہ آج ہم (انسان) جو بھی ہیں وہ کئی مذاہب اور قوموں کے لوگوں کی وجہ سے ہیں۔ لہذا ہم کو انسان بن کر سوچنا چاہیئے۔ اور زبان، مذہب، رنگ اور علاقے کی بنیاد پر برتری کے دعووؤں کو مسترد کر دینا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ نفرت چاہے کسی بھی بنیاد پر تہذیب کی ترقی کے پہیے کو آگے نہیں دھکیل سکتی۔ اگر ہم وطن پرست یا تنگ نظر مذہبی انسان ہو کر سوچتے ہیں اور تکبّر میں دوسری قوموں کے انسانی ترقی میں کردار کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں تو پھر ہمارے لئے اپنے جینے کا جواز بھی پیش کرنا مشکل ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہوں اور مذہبی بنیادوں پر سوچتے ہوئے ایک چیز کو اسلامی اور دوسری کو غیر اسلامی قرار دے دیتا ہوں تو پھر ہم جو آسائشاتِ

زندگی استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کیا جواز (Justification) پیش کریں گے۔ ایسی سوچ کے مطابق مجھے اپنے گھر کے بلب کو توڑنا پڑے گا کیونکہ یہ ایڈیسن کی ایجاد ہے، جو کہ ایک عیسائی تھا۔ آئن اسٹائن کی تھیوری کو پڑھنا چھوڑنا پڑے گا کیونکہ وہ یہودی تھا۔ یوگا کرنے سے اجتناب کرنا ہوگا کیونکہ اسے ہندوؤں اور بدھوں نے متعارف کروایا تھا۔ فلسفے کو بھولنا ہوگا کیونکہ اس کی ترویج یونان میں ہوئی۔ اسی طرح اگر ایک عیسائی مذہبی بنیادوں پر سوچتا ہے تو وہ وورڈز ورتھ (Woordsworth) کی شاعری اور سپی نوزا کے فلسفے سے لطف نہیں لے سکتا کیونکہ وہ وحدت الوجود پر یقین رکھتا ہے جو کہ عیسائیت کے تثلیث (Trinity) کے عقیدے سے متصادم ہے۔ عظیم جرمن فلسفی Schopendhaur بدھ ازم کے بے معنویت اور قنوطیت کے نظریئے سے بہت متاثر تھا۔ نطشے زوراسٹر کے خیالات سے متاثر تھا، جس نے دو خداؤں کا تصور پیش کیا اور جدید Eco Feminists نے اپنے خیالات کی بنیاد ہندوؤں اور بدھوں کے تصور فطرت پر رکھی۔ چنانچہ ایک عیسائی یا قوم پرست کس طرح سے کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے وہ عیسائیوں یا مغرب کا دیا ہوا ہے۔ جبکہ وہ دیکھ سکتا ہے کہ مغرب نے دوسری ثقافتوں، زبانوں، مذاہب اور علاقے کے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

## IDENTITY (شناخت)

پچھلے باب میں ہم نے مسترد کر دیا تھا کہ شناخت مذہب، قومیت اور علاقہ پر پوری طرح انحصار کرتی ہے۔ ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ پھر ہماری شناخت کیا ہے؟ وہ کیا قدر یا خصوصیت ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرتی ہے؟ اور وہ کیا تعلق ہے جو انسان کو دوسرے انسان سے قریب لاتے ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ معاشرتی مسئلہ (Social Issues) کسی بھی معاشرہ میں یکجا کرنے والی قوت ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اگر ایک علاقے کے لوگوں کو آلودہ پانی فراہم کیا جاتا اور اس علاقے کے تمام لوگوں کو اس کی وجہ سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جبکہ اس علاقے کے رہائشی مختلف مذاہب، مسالک، قوموں اور ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اُن کا مسئلہ مشترک ہے، جو کہ گندے پانی کی سپلائی ہے۔ اب اگر اُس علاقے کے پچاس پنجابی، پچھتر سندھی، اسّی اردو بولنے والے اور پچاسی بلوچ علیحدہ احتجاج کرتے ہیں، تو اُنکا احتجاج مئوثر نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس علاقے کے تمام لوگ متحد ہو جاتے ہیں اور اپنے مذہبی، قومیتی اور دوسرے اختلافات کو ایک طرف رکھ کر احتجاج کرتے ہیں تو مجاز اداروں کو انہیں سننا پڑے گا۔ چنانچہ اس معاملے میں یہ مذہب، زبان، قومیت یا کوئی اور خصوصیت نہیں ہے جو لوگوں کو متحد کر رہی ہے بلکہ یہ سماجی مسئلہ ہے جس نے انہیں ایک کر دیا ہے اور حکومتی اداروں کو ان کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ یہ محض مفروضہ نہیں ہے بلکہ ماضی میں بھی لوگوں نے مسئلوں کی بنیاد پر خود کو متحد کیا اور مسئلوں کو حل بھی کروالیا تھا۔ مثلاً 1980 کے عشرے میں پاراچنار اور NWFP کے لوگ طویل عرصے سے بجلی کے مسئلے کا سامنا کر رہے تھے۔ یہ علاقہ سنّی اور شیعہ لوگوں پر مشتمل ہے اور آج بھی حساس علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے بھی مل کر ضیاء حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ فوجی حکام نے فائرنگ کی جس سے پانچ لوگ ہلاک ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں دو سنّی فرقے اور تین اثناء عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن دونوں گروپوں کے لوگ اتنے تحمل سے تھے کہ مقتولوں کی نمازِ جنازہ پہلے سُنّی امام نے پڑھائی پھر شیعہ امام نے۔ شیعہ اور سنّی دونوں مسالک کے لوگوں نے نماز

جنازہ میں شرکت کی اور اُن کی تدفین کی۔ کیا کوئی اس درجہ کی رواداری کا تصور کراچی، لاہور اور راولپنڈی جیسے معتدل مزاج شہروں میں بھی کر سکتا ہے؟

ایک اور مثال بولان میڈیکل کالج کوئٹہ کی تعمیر کی ہے۔ بلوچستان پاکستان کا سب سے زیادہ پسماندہ صوبہ ہے۔ چند عشروں قبل صوبے میں کوئی کالج نہیں تھا اور بہت سے بلوچ طلباء کو میڈیکل سائنسز پڑھنے کے لئے کراچی اور ملک کے دوسرے حصوں میں جانا پڑتا تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی کے وہ طلباء جو کہ بلوچی نہیں تھے انہوں نے بلوچ طلباء کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے ایک تحریک چلائی جس میں کوئٹہ شہر میں ایک میڈیکل کالج کی تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اُن طلباء کی کوششوں سے حکومت کو کالج تعمیر کرنا پڑا۔

جنرل ایوب خان کے دور میں جامعہ کراچی آٹھ طلباء ایوب کی فوجی انتظامیہ کے ہاتھوں مارے گئے۔ پورے ملک کے طلباء نے ان ہلاکتوں کے خلاف احتجاجی تحریک چلائی اور ثابت کر دیا کہ لوگوں کو مذاہب، مسالک اور قومیتوں کے نام پر تقسیم کرنا بے فائدہ ہے۔ چنانچہ لوگوں میں اپنے سماجی مسئلہ کی بنیاد پر بھی اتحاد ہو سکتا ہے۔

شناخت کے بارے میں یہ کہوں گا کہ درحقیقت ہمارا طبقہ ہماری شناخت ہے۔ ہم قوم پرست، بنیاد پرست یا کچھ اور ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن حقیقت میں ہم ایک طبقاتی معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارا طبقہ ہماری پہچان ہے۔ ہمارے لیڈر ہمیں مذہب اور زبان کے نام پر لڑواتے رہتے ہیں، لیکن اگر ہم کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا دورہ کریں ہم وہاں بلوچستان کے سرداروں، صوبہ سرحد کے خوانین، سندھ کے وڈیروں اور پنجاب کے چودھریوں کو زندگی کا لطف لیتے ہوئے ایک ہی چھت کے نیچے پائیں گے۔ یہ کیا مذاق

ہے کہ اونچے طبقے کے لوگ اس قوم پرستی پر یقین نہیں رکھتے، اگرچہ وہ لوگوں کو بیوقوف بنانے کیلئے اُس کا پرچار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فاروق لغاری بلوچ ہیں لیکن ان کے بہنوئی پختون ہیں۔ پیر پگارا سندھی ہیں لیکن اُن کے داماد پنجابی ہیں۔ سو اونچے طبقے میں قومیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ صرف نچلے طبقات میں وجہ نزاع ہوتی ہے اور یہ لیڈران ہوتے ہیں جو اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے یہ تنازع پیدا کرتے ہیں۔

یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ قومیت اور کلچر طبقہ سے زیادہ اہم ہیں۔ اگر ایک پوش علاقے کی مختلف النوع آبادی کا مشاہدہ کریں تو ہم نوٹ کریں گے کہ یہ منطق درست نہیں ہے۔ مثلاً پوش علاقے کے لوگوں کا معیار زندگی تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ وہ اچھا کماتے ہیں، اُنکے بچے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہ مختلف کلبوں کے ممبر ہوسکتے ہیں وہ سب پرائیوٹ ہسپتالوں میں علاج کرواتے ہیں۔ اس کے برعکس غریب لوگ جن کا تعلق ایک علاقے سے ہو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، شیعہ ہو یا سنّی، پنجابی ہو یا پٹھان، مہاجر ہو یا سندھی، بلوچی ہو یا سرائیکی معیار زندگی اور مسائل ایک جیسا ہوتا ہے۔ تمام لوگوں کو آلودہ یا کم صاف پانی پینا پڑتا ہے۔ ان سب کو رات میں مچھروں سے لڑنا پڑتا ہے۔ ان سب کو سرکاری ہسپتالوں میں پیلی اور لال دوائی استعمال کرنی پڑتی ہے، سب کو اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔ سب کو لوڈ شیڈنگ، مہنگائی اور محرومی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ اُن ہی کے مسلمان، ہندو، عیسائی، شیعہ، سنی، پنجابی، بلوچی، پختون، سندھی، مہاجر اور گجراتی بھائی پوش علاقوں میں ایک بہترین معیار زندگی کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں۔

جب گرمی ہوتی ہے غریب لوگ سورج کی جھلسا دینے والی دھوپ میں کام کرتے

ہیں، جیسے کہ انڈیا اور پاکستان کے لوگ راتوں کو لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے سو بھی نہیں پاتے۔ جبکہ اُن ہی کی قومیت اور مذاہب کے لوگ ایسے مسائل برداشت نہیں کرتے۔ وہ ائرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں، ائرکنڈیشنڈ کمروں میں سوتے ہیں، اور ایسے اسکولوں، ہسپتالوں، شاپنگ سینٹرز میں جاتے ہیں جو پوری طرح ائرکنڈیشنڈ ہوتے ہیں۔ بارشوں کے موسم میں جب غریب لوگ اپنی خستہ حال چھتوں سے ٹپکتے پانی سے پریشان ہوتے ہیں۔ امیر لوگ راہ گیروں پر اپنی کاروں سے چھینٹے اُڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ سردی سے غریب لوگوں کے وجود شل ہوجاتے ہیں لیکن اُن کے پاس گرم کپڑے خریدنے کیلئے پیسے نہیں ہوتے جبکہ امیر لوگ سردی کے موسم کو مہنگے گرم لباسوں اور میوہ جات سے Enjoy کرتے ہیں۔ امراء کے گھر گندے اور پسماندہ علاقوں کے مکانوں کے برعکس ہیٹر سے گرم ہوئے ہوتے ہیں۔

پوش علاقوں کے لوگ اکثر اپنی ثقافت بھول جاتے ہیں۔ ثقافت کا یہ فوبیا نچلے طبقات میں زیادہ عام ہے اور اسے انکے لیڈر تحریک دیتے ہیں۔ جن کا تعلق اونچے طبقے سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ پوش علاقے کے کسی سندھی کو اجرک اور سندھی ٹوپی، یا کسی پنجابی کو پیلا کرتا اور سفید دھوتی، یا کسی بلوچ کو پگڑی پہنے شاذونادر ہی دیکھیں گے۔ وہ ایسے کپڑے پہننے کو ترجیح دیں گے، جو مغرب کا اونچا طبقہ پہنتا ہے۔ جو کہ فیشن کہلاتا ہے۔ وہ اپنی زبانیں بولنے پر فخر نہیں کریں گے بلکہ وہ کسی بین الاقوامی زبان مثلاً انگلش بولنے کو ترجیح دیں گے۔ اونچے طبقے کا یہی رویہ انڈیا میں تامل، مراٹھی، مدراسی، بنگالی اور سندھی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، جو اپنی ثقافتی روایتوں پر نہیں چلتے، بلکہ وہ ایسی چیزیں اختیار کریں گے جو کہ اُنکے اسٹیٹس کو زیب دیتی ہوں۔ تاریخی طور پر بھی انڈیا میں ایک طویل عرصے تک اونچا

طبقہ فارسی بولا کرتا تھا اور فارسی کلچر ہی اختیار کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ حکمران طبقہ کا کلچر تھا۔ یہاں تک کہ ہندو اور جین اشرافیہ بھی فارسی بولا کرتی تھی۔ غیر عرب دنیا میں عرب زبان اور کلچر کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ کیونکہ حکمران طبقہ عرب تھا اور عرب کالونیوں (مقبوضات) کی اشرافیہ عرب ثقافت اور زبان کو پسند کرتے تھے۔ پاپائیت کے دور میں لاطینی زبان کو اہمیت دی جاتی تھی کیونکہ یہ حکمران طبقے کی زبان تھی۔ انگلش، فرانسیسی، جرمن اور دوسری مغربی قوموں کی اشرافیہ لاطینی زبان اور کلچر کو ترجیح دیتی تھی۔ ایک لمبے عرصے تک یورپ میں فرانسیسی زبان، کھانے، لباس اور روایتیں غالب رہیں۔ انگلینڈ اور انگلش امیر طبقہ فرانسیسی زبان پسند کرتا تھا کیونکہ یہ اُس دور کی نمایاں زبان تھی۔ چنانچہ اونچا طبقہ تقریباً پوری دنیا میں اس زبان اور ثقافت کو ترجیح دیتا ہے جو دنیا میں غالب ہو نہ کہ اپنی ثقافت اور زبان کو۔ طبقاتی اختلاف کسی ایک معاشرے تک محدود نہیں وہ ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم پنجابی، سندھی، بلوچ، پختون، مراٹھی، گجراتی، انگریزوں، فرانسیسی، اطالوی، ڈچ، انڈین، مسلم، ہندو، یہودی، عیسائی، بدھ، سکھ وغیرہ کے بیٹوں اور بیٹیوں کو دنیا کے مہنگے ترین تعلیمی اداروں ہارورڈ، کیمبرج، آکسفورڈ، لندن اسکول آف اکنامکس میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس غریب انگریزوں اور امریکیوں کے پاس ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وسائل نہیں ہیں۔ ان مہنگے تعلیمی اداروں میں تقریباً تمام قومیتوں اور مذاہب کے لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اکثریت میں صرف ایک قدر مشترک ہوتی ہے وہ اُنکا اونچا طبقہ ہے۔ ایسے تعلیمی اداروں میں تعلیم مکمل کر کے طالبعلم اپنے ملکوں میں اہم انتظامی عہدوں پر مامور ہو جاتے ہیں اور ایسی پالیسیاں بناتے ہیں جو کہ انکے طبقے کو مزید مضبوط کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں امیر مزید امیر اور غریب، غریب تر ہو جاتا ہے۔

یہی طبقاتی پس منظر اور مشترک مسئلہ نچلے طبقے کے لوگوں کو متحد کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں طبقات کی بنیاد پر معاشرتی تقسیم ایک تلخ حقیقت ہے۔ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہے جس پر مزیدار کھانے سجے ہوئے ہیں اور وہ سوچ رہا ہے کہ اُسے پہلے کیا کھانا چاہئے لیکن دوسری طرف ایک خوبصورت فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے ایک لڑکا چیتھڑوں میں ملبوس روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے ترس رہا ہے۔ ایک طرف تو ہم سوڈان، لاؤس، صومالیہ میں اور بہت سے دوسرے مما لک میں لوگوں کو بھوک سے مرتے ہوئے دیکھتے ہیں دوسری طرف ہم پڑھتے ہیں کہ امریکہ ہزاروں ٹن گندم سمندر میں اس لئے تلف کر دیتا ہے کہ کہیں گندم کی قیمتیں زیادہ رسد (Supply) کی وجہ سے نہ گر جائے۔ یہاں ایک فوٹو گرافر کی خودکشی کا حوالہ ضرور دینا چاہوں گا۔ خوشحال مغرب سے ایک فوٹو گرافر 1990 کے عشرے میں سوڈان گیا اور سوڈانی بچے کی تصویر محفوظ کر لی۔ تصویر میں بچے کی پسلیاں نمایاں تھیں، وہ غربت اور قحط کی وجہ سے انتہائی لاغر ہو گیا تھا۔ سوڈان کو قحط نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ تصویر اُس بچے کی مظلوم حالت کی منظر کشی کر رہی تھی۔ وہ ایک کیمپ کی طرف ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل خود کو دھکیل رہا تھا جبکہ ایک گدھ اسکا پیچھا کر رہا تھا وہ گدھ اُس بچے کی موت کا انتظار کر رہا تھا، کہ بچے کا دم نکلے اور وہ اس کو چیر پھاڑ سکے۔ اُس فوٹو گرافر کو بین الاقوامی ایوارڈ ملا لیکن اس نے کچھ عرصے بعد خودکشی کر لی۔ جو دکھ اس نے تصویر لینے کے بعد محسوس کیا اس دکھ نے اُس فوٹو گرافر کی جان لے لی۔ وہ اس دنیا کا حساس انسان تھا جو بے اعتناء، خود پسند اور سنگدل لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ جو منافع کی خاطر کچھ بھی کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ دنیا خاص طور پر مغرب نے اس خودکشی سے کچھ نہیں سیکھا۔ اور آج بھی ہم یہ پڑھتے ہیں کہ برطانیہ کی دودھ کی کمپنیاں ہزاروں لیٹر

دودھ دریاؤں اور جھیلوں میں بہا دیتی ہیں کہ کہیں دودھ کے نرخ زیادہ پروڈکشن اور سپلائی کی وجہ سے نہ گر جائیں، جبکہ دوسری طرف ہم پڑھتے ہیں کہ ایک ملین بچے دودھ کی قلت اور ناکافی خوراک کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ نارتھ کوریا میں 2.2 ملین بچے دودھ کی قلت اور غذائی کمی کی وجہ سے موت کی دہلیز پر ہیں۔ پانچ ریاستوں کا بجٹ ایک برطانوی سرمایہ دار کے سرمایہ کے برابر ہے۔ مٹسوبشی کمپنی کی معیشت انڈونیشیا کی معیشت سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ جنرل ٹائرز کی سالانہ آمدنی کچھ چھوٹی افریقی ریاستوں سے زیادہ ہے۔ ایک طرف تو ہم امراء، اونچے اونچے بزنس مینوں، امیر کبیر سرمایہ داروں کو دیکھتے ہیں جو دنیا میں گھومتے ہیں۔ اُنکا ناشتہ پیرس میں، دوپہر کا کھانا برلن میں اور ڈنر لندن میں ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف لوگوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں جو دن رات سخت محنت کرتے ہیں اور انکے پاس اپنا قصبہ یا شہر دیکھنے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔ امریکہ، کینیڈا، جاپان اور دیگر مغربی ممالک دنیا کی آبادی کا بیس فیصد ہیں، لیکن اس بیس فیصد آبادی کی انتہائی کم تعداد میں پائے جانے والے امراء کے پاس اس وقت دنیا کی دولت کا ستّر فیصد ہے۔ دنیا بھر میں پائے جانے والے امراء نہ صرف دنیا کو لوٹ رہے ہیں بلکہ یہ فطرت کو بھی بری طرح استعمال کر کے انسانیت کو تباہی کے دروازے پر دھکیل رہی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ کچلے ہوئے طبقات اس غیر منصفانہ نظام کیخلاف بغاوت کر دیں اور طبقاتی نظام کا خاتمہ کر دیں۔

# دلت اور قومی سوال

یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر اس ذہن میں پلتا ہے جو اس نظام اور اس کے حواری حکمران طبقے کے ظلم وستم کا شکار ہیں۔ ہم اس موضوع پر دلتوں کا نقطۂ نظر رکھنے کی کوشش کریں گے۔ دلت پاکستان میں آباد ایک اہم سماجی گروہ ہے۔ دلت جنوبی سندھ میں بڑی اکثریت میں آباد ہیں اور مجموعی طور پر پاکستان کی زراعت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دلتوں کو سماجی شناخت کے بحران کا بھی سامنا ہے۔ دلت صدیوں سے پسے اور کچلے ہوئے آ رہے ہیں۔ دلتوں کی حقیقی تعداد ایک اندازے کے مطابق ۲۰ سے ۳۰ ملین کے قریب ہے۔ دلت کون ہیں؟ دلت کیا چاہتے ہیں؟ دلت طبقہ کو کن مسائل کا سامنا ہے؟ ہم کوشش کریں گے کہ اس مضمون میں دلتوں کی آواز کو پاکستان کے قومی پس منظر میں پیش کیا جائے۔

## تقسیم ہند

تقسیم ہند سے ہی قومی تشخص کا بحران برصغیر کا المیہ رہا ہے کہ اس اسثنا میں ڈاکٹر

باباصاحب بھیم راؤ امبیدکر کی کتاب "Thoughts on Pakistan" ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب راویتی انداز سے ہٹ کر ایک دیوانی مقدمہ کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں دلت (دراوڑنسلوں) کی تاریخی، معاشی، سیاسی اور قومی پس منظر کو بہتر انداز سے پیش کیا گیا ہے اور ان کے دلائل اور اسباب کو ان ہی کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تاریخی دستاویز میں ان اُداس نسلوں کے دکھوں کا مداوا ان کے سیاسی، معاشی اور سماجی حقوق تسلیم کرنے کی صورت میں تجویز کیا گیا۔ بڑی ستم ظریفی ہے کہ اس اہم تاریخی دستاویز کو کبھی بھی شعوری طور پر تسلیم کرکے اس سے استفعادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے دونوں ریاستوں کے حکمران طبقات نے اسے اپنے مفاد ومقصد کے لیے الگ الگ اقتباس کا انتخاب کیا جو صرف ان کے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی شعوری کوشش تھی۔ مگر ضرورت اس بات کی تھی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرکے اس دور کے قومی سوال کو پرکھنے کی غرض سے اس دستاویز کا مطالعہ کیا جاتا۔ تقسیم ہند کی پسماندہ اور ترقی یافتہ علاقوں کی تقسیم نے ثابت کیا پسماندہ علاقوں کی اشرافیہ نے پسماندگی کے نعرے کو اپنے اقتدار کے دوام کے لیے استعمال کیا اور اپنی حاکمیت کو مضبوط کیا۔ برصغیر کا قومی آزادی کا سوال دراصل محنت کش طبقات کی آزادی کا سوال تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہی وہ طبقات تھے جو سماج میں سماجی اور معاشی ظلم وستم کا شکار ہیں۔ برصغیر کا یہ بھی المیہ ہے کہ یہاں طبقات کی ساخت کے ساتھ ساتھ قومی شناخت اور تشخص کا سوال بھی انتہائی پیچیدہ بن چکا ہے۔ یہاں کے اکثریتی محنت کش طبقات کلاسیکل صنعتی مزدور طبقات نہیں ہیں بلکہ ذات اور طبقہ آپس میں گڈمڈ ہیں۔

انڈیا اور پاکستان دونوں ممالک تقسیم ہند سے لے کر آج تک صحیح معناوں میں ایک قوم نہیں بن سکے ہیں۔ ہماری قدیم تاریخ میں صرف بدھ حکمرانوں کے دور میں برصغیر

ایک قوم یا ملک کہلانے کا حقدار تھا۔عبدالرشید دھولکہ نے اپنے مضمون قومی مسئلہ میں ہماری قدیم تاریخ کے اس اچھوتے باب کو چھیڑا ہے جواب تک ہمارے سندھ کی نام نہاد قوم پرستی کے نصاب میں شجرممنوع بنا ہوا تھا۔ہمارے قوم پرست قومی دانشوروں اور مفکروں نے ہماری قدیم تاریخ کو بدھ حکمرانوں سے یا اس سے بھی پیچھے جا کر شروع کرنے کی بجائے راجا داہر سے ہی شروع کرنا مناسب جانا؟ راجا داہر کو ایک جذباتی کردار دے کر انتہائی مقدس گائے بنایا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ محمد بن قاسم کو ایک حکمران گروہ نے اپنے مقاصد کے لیے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ ہماری تاریخ کا یہی المیہ ہے ہر غاصب حکمران نے اپنی مرضی اور منشا کی تاریخ لکھوائی۔قدیم ہندوستان میں ذات پات کا تضاد بھی کمزور اور طاقتور طبقات کا تضاد ہے۔طاقتور طبقات کے پاس اقتدار و وسائل رہے ہیں جبکہ محکوم طبقات کے پاس عددی اکثریت اور محنت کے سوائے کوئی وسیلہ نہیں۔

میرے خیال میں ہڑپہ اور موہنجوڈاڑو کی قدیم تہذیب کے بعد مجموعی طور پر ہمارے سماج کی یہ دوسری بڑی عظیم حاصلات تھیں۔جس میں ذاتوں اور قبائل وطبقات میں بٹے لوگ نہ صرف برصغیر کو ایک قوم بنا سکے اور گوتم بدھ کے مساوات کے آفاقی پیغام کو پورے ایشیاء میں پھیلا دیا۔جس کے نقوش و آثار آج بھی زندہ و جاوید صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔مقتدر قوتوں نے برصغیر کے اس عظیم انقلاب کو سازشوں سے ختم کرنے کی کوشش کی اور بلاآخر کامیابی حاصل کی۔سندھ میں راجا چچ کا رائے خاندان پہ غلبہ اس سازش کی اہم کڑی ہے۔راجا چچ اور داہر کے دور میں اکثریت (جو بدھ فکر کو مانتی تھی) کو کچلا گیا اور ذات پات کی زنجیروں میں قید کیا گیا۔

اس وقت کے سماجی تضاد کا فائدہ بیرونی طاقتوں نے اٹھایا۔عوامی اکثریت کی برہمن حکمران طبقات سے ناراضگی کی وجہ سے عرب حکمرانوں نے آسانی سے برصغیر کو فتح

کر کے یہاں کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اکثریتی طبقے کو بغاوت سے روکنے کے لیے اور ان کے برہمن حکمرانوں سے تضاد کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہوئی اور اکثریتی طبقے کے لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا (یہی تضاد آگے چل کر دو قومی نظریے کی بنیاد بنا جس کے لیے مسلمان نہیں بلکہ ہندوستان پر حاوی برہمن سوچ ہی ذمہ دار ہے۔)

تقسیم ہند کے وقت ایک طرف اہم فریقین میں مقتدر اجاتیوں پر مبنی برہمن طبقہ تو دوسری طرف مسلمان اشرافیہ کی قیادت تھی جبکہ تیسری سیاسی قوت صدیوں سے کچلے ہوئے پسماندہ طبقات (اچھوت، ادیواسی اور دلت) کی تحریک تھی جن کی قیادت ڈاکٹر بابا بھیم راوء امبیدکر کر رہے تھے۔ مسلم لیگ جو مسلمانوں کے حقوق کی دعویدار تھی حقیقتاً صرف مسلمان اشرافیہ (نوابوں، جاگیرداروں اور تاجر اشرافیہ) طبقے کے مفادات تک محدود رہی۔ مسلم عوام کی محنت کش طبقات کے تاریخی، سیاسی، سماجی و معاشی پسماندگی کا نعرہ دراصل نوابوں اور جاگیرداروں کو اقتدار کی مسند تک پہچانے کے لیے تھا۔

دوسری طرف کانگریس تھی جو غیر ملکی حکمرانوں کے تسلط سے آزاد اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ دراصل کانگریس برہمن طبقے کی قیادت میں ہندوؤں کے اونچی جاتیوں کی سیاسی اور معاشی اقتدار کے ساتھ ساتھ سماجی اقتدار کو بھی دوام بخشنا چاہتی تھی۔ وہ سماجی اقتدار جو ذات پات کے دھرم پر استوار تھا، ایک ایسا دھرم جس میں اچھوت لوگوں کا ایک بڑا سماجی حصہ صرف نچلے درجہ پہ ہی رہ کر باقی طبقات کی ذہنی، جسمانی، سیاسی، معاشی و سماجی غلامی قبول کر کے زندہ ہو۔

تیسری جانب دلت تحریک اس دور کی ایک اہم سماجی و سیاسی تحریک تھی جو برابری کی بنیاد پر اپنا تشخص اور حقوق حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس تحریک کو برصغیر کے ایک عظیم مفکر

اور انقلابی شخصیت ڈاکٹر بابا بھیم راوء امبید کر لیڈ کر رہے تھے۔ گو کہ تقسیم ہند کی سیاسی تحریکیں اور ان کے رہنما آج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں مگر دلت ازم کا نظریہ اور افکار نہ صرف آج بھی زندہ ہے بلکہ اپنی اہمیت کا بھی احساس دلوا رہا ہے۔

آج دلت ازم کا نظریہ ہندوستان اور جنوبی ایشیائی ریاستوں کے ممالک کے دلتوں کی بقا اور سیاسی و معاشی آزادی کی منزل بن گیا ہے۔ کانگریس بھارت یا ہندوستانی قوم کے نظریے کی قائل تھی۔ ایک ایسی قوم جس کا قومی سرمایہ دار یا حکمران طبقہ صرف اونچی جاتی کی ہندو برادری تک محدود ہو باقی عوام اور دوسرے متوسط طبقات کو ان کے رحم و کرم پر ہی اکتفا کرنا تھا۔ یورپ کے جدید سرمایہ داری نظام جس نے جاگیرداری، نوابوں، مہاراجوں اور مقامی جاگیردار اشرافیہ کو شکست فاش دے کر برصغیر پر قبضہ اور اپنا غلبہ قائم کیا تھا، اس کے لیے بدلتے ہوے عالمی حالت میں اس اقتدار کو قائم رکھنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ خاص طور پر بالشویک انقلاب اور چین میں جاری انقلابی جہد و جہد کے متوقع انجام نے اور بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔

کیونکہ اس سے نہ صرف ان کو برصغیر پر اپنی گرفت کمزور نظر آنے لگی تھی بلکہ ساری دنیا میں سامراجی طاقتوں کے لیے اپنا استحصالی نظام جاری رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے برصغیر کے عوام کو جغرافیائی طور پر نہیں بلکہ مذہبی و قومی لحاظ سے تقسیم کر کے آپس میں الجھائے رکھا اور عوام کے مابین سماجی، مذہبی، ریاستی خلیجوں کو گہرا کیا۔

۴۷ء کی تقسیم ایک ایسا المیہ تھا جس کی بھاری قیمت صرف یہاں کے محنت کش طبقات کو ہی ادا کرنا پڑی۔ کانگریس اندرونی طور پر تقسیم ہند کو تسلیم کرنے کا سمجھوتہ کر چکی تھی۔ مسلم اشرافیہ کو مغربی و مشرقی ریاستوں کی صورت میں حکمرانی کا پروانہ ملنے جا رہا تھا۔ ہندو جاتی کے مقتدر طبقہ کو ایک بڑی اقلیت سے جان چھوٹنے کی نوید ملی۔ عام مسلمان تین

حصوں میں بٹ گئے۔ایک حصہ مغربی پاکستان، دوسرا حصہ مشرقی پاکستان بنا جبکہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت باقی ماندہ ہندوستان میں اوپری جاتی کے ہندوؤں کے رحم وکرم پر سماجی و سیاسی استحصال کا سامنا کرنے کے لیے رہ گئی۔ دلتوں کی حالت اس سے بھی بدتر تھی اور ہے۔ ہندو حکمراں طبقہ دلتوں کو اپنا ازلی دشمن گردانتا تھا۔ اس لیے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں دلتوں کے ان حقوق کو بھی سبوتاژ کرنے کی ابتدا کی جو دلت تحریک نے اپنی جہدوجہد سے انگریز سرکار سے حاصل کیے تھے۔ ہندو مسلم فساد برصغیر کا مقدر بن چکا تھا۔ اس حاوی تضاد میں دلتوں کا تضاد پس منظر میں چلا گیا۔دلت تین حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک مذہبی اقلیت ہونے کے ناطے سماجی استحصال اور بھی شدید ہوگیا۔ جوگندر ناتھ منڈل کا استعفیٰ اس بات کا ثبوت ہے کہ دلتوں کے لیے زمین پاکستان میں بھی تنگ ہونا شروع ہوگئی تھی۔

تاریخ کے اس دور میں بھارتی لیفٹ اپنا تاریخی اور سیاسی کردار ادا کرنے سے قاصر رہا اور اس کے کئی ایک تاریخی اسباب ہیں۔اپنے سماجی تضادات اور حالات کو یکسر نظرانداز کر کے اپنے فیصلے باہر سے برآمد کرنے کی روش نے بائیں بازو کی لہر کو ان سماجی پرتوں کا ترجمان بننے سے کوسوں دور رکھا۔مرحلہ وار انقلاب کی تھیوری پر عمل بھی ایک غلطی تھی۔ برصغیر کی مذہبی تقسیم کی سپورٹ کے بعد اپنی کیمونسٹ پارٹی کے کیڈر کو ہندو مسلم کی بنیاد پر تقسیم کرنے جیسے مضحکہ خیز فیصلے بھی دیکھنے کو ملے۔اس طرح کے مبہم فیصلوں نے بھی انقلابی کیڈر اور ورکروں کو الجھائے رکھا۔اگر بھارتی لیفٹ اپنے پاؤں اس زمین پر رکھ کر یہاں کے سماجی تضادات کا احاطہ کرتے ہوئے اصل انقلابی پرتوں کو متحرک کرتا تو تقسیم ہند جیسے المیوں کو بھی ٹالا جا سکتا تھا اور برصغیر کی سوشلسٹ فیڈریشن کا قیام بھی روشن ہوسکتا تھا جو برصغیر کی سبھی نارسائیوں اور ناانصافیوں کا انتقام ہوتا۔اس وقت کے بھارتی لیفٹ کی تاریخی

کوتاہیوں پر برصغیر کی سوشلسٹ تحریک کی تاریخ انھیں کبھی بھی معاف نہیں کرے گی۔

## تقسیم ہند کے بعد دو ریاستوں کا قیام اور قومی تشخص کا بحران

دنیا کے گولے میں جب ہیکل سلیمانی کے ورثا نے ۱۰۰ سال کی جلاوطنی کے بعد فلسطین پر قابض ہو کر ایک مذہبی ریاست بنانے کا اعلان کیا تب برصغیر میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے ساتھ ملت اسلامیہ کے لیے پاکستان کا وجود رکھا گیا۔ پاکستان بننے کے بعد دونوں ریاستوں کے مقتدر حکمران طبقے پہ ذمہ داری عائد ہو چکی تھی کہ وہ دونوں ریاستوں کو ایک قوم بنانے فریضہ مکمل کریں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ تقسیم ہند کو ۷۰ سال گزرنے کے باوجود آج بھی پاکستان اور ہندوستان ایک قوم نہیں بن سکے۔ حکمران طبقہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں بری طرح ناکام ہے۔ ہندوستان میں اونچی جاتی کے حکمران طبقات نے بے پناہ ریاستی قوت تو حاصل کر لی مگر سماج کو یکجا کر کے ایک قوم بنانے کے فریضے میں مکمل ناکامی سے دوچار ہے۔ پاکستان کے حکمران طبقے کا المیہ یہ بھی رہا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی قومی سرمایادار اپنے بل بوتے پر ملک کو چلانے سے قاصر رہا ہے۔ اس طبقے کی نااہلی کی وجہ سے کبھی مذہبی انتہاپسندی کو سہارا دے کر ایمان کے زور پر ملک چلانے کی کوشش کی گئی تو کبھی ریاستی اداروں کو اقتدار کے معاملات میں مدعو کر کے ان کے مہروں سے گلشن کا کاروبار چلایا جانے لگا۔ پاکستان کے کلاسیکل بورژوا کی اس نااہلی کی ایک بھاری قیمت بھی اس کو ادا کرنا پڑی اور آج یہ حالت ہے کہ کلاسیکل بورژوا کی جگہ ان دونوں عناصر نے لے لی ہے اور حکمران طبقہ صرف شوپیس بن کر رہ گیا ہے۔ اس سے پاکستان کے بطور ایک نوسرمایہ دار لبرل قوم بننے کے امکانات بھی معدوم ہو گئے اور ملک کے اندر کئی ریاستوں نے جنم لے لیا ہے اور ان کے اثرات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں

ایک طرف ریاستی قوم پرستی کے بیانیے کے مذہبی انتہا پسندوں کے ہاتھوں یرغمال ہونے کے نتیجے میں مقامی ثقافتی رنگارنگی کو مندمل کرنے کی کوشش نے پاکستان کی قومیتوں میں محرومی کے احساسات پیدا کیے تو دوسری طرف قوم پرستوں کے بیانیے نے ہماری وادی سندھ کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔

۷۰ کی دہائی کی مزدور کسان تحریک کے ابھار اور راویتی انقلابی قیادت کی مبہم لائن کی بدولت مزدور طبقے کی تحریک کو اپنے حدف سے دور کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔اس کا انجام پاپولرازم، مذہبی انتہا پسندی اور قوم پرستی کے ابھار کی صورت میں عوام کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔قوم پرست تحریکیں جو حقیقت میں چھوٹی قومیتوں کے حکمران گروہوں کے مفادات کے لیے سرگرم ہیں۔لیفٹ کی ناکامی سے انہیں خالی میدان میسر ہوا۔قوم پرست تحریکیں محنت کش طبقے کے مفادات اور جاگیردارانہ قیادتی پس منظر کی بدولت محنت کش طبقے سے کوسوں دور ہیں۔سندھ کے قوم پرست حلقوں میں قومی جہد وجہد کی جو روایات پائی جاتی ہیں وہ سندھ کے مجموعی محنت کش عوام کو اپیل نہیں کرتیں اور قوم پرستوں کے نظریات محنت کش عوام سے میل نہیں کھاتے۔آخری تجزیہ میں قوم پرست (نام نہاد عوامی جمہوریت اور ماو کیپ پہننے والے قومی بورزوا قوم پرست) بھی اپنی قوم کے بالائی طبقات کے مفادات کے لیے لڑتے ہیں۔اس لیے سندھ اور بلوچستان کے قوم پرستوں نے زبانی جمع خرچ کے طور پر مظلوم طبقات کی نمائندگی کا دعویٰ کیا مگر خود کو طبقاتی تضاد سے دور رکھا۔لیفٹ کے لٹریچر کو اپنے نصاب کا حصہ بنانے والے بھی اپنی صفوں سے محنت کش کارکنوں اور انقلابی نظریات رکھنے والے کیڈر کو پیچھے دھکیلتے رہے۔اب کی صورتحال یہ ہے کہ مجموعی طور پر قوم پرست حلقوں نے مڈل کلاس پرتوں پر انحصار کو بڑھانا شروع کر دیا ہے۔یہ مڈل کلاس اپنے

ذاتی مفادات کے لیے انتہاپسندی کی ہارڈلائن سے لے کر سیکولرازم اور ترقی پسندی کی کشتیوں میں بیک وقت سوار ہیں۔ مڈل کلاس طبقات کا اس طبقاتی نظام میں کوئی کردار نہیں ہے۔ وہ نہ تو محنت کش طبقات کی طرح سماج کا پہیہ چلانا والے ہیں اور نہ ہی حکمران طبقات کی طرح وسائل پر غالب ہے۔ موجودہ نظام میں وہ غالب طبقات کا حامی رہتا ہے اور اپنی جگہ کو مضبوط کرنے اور موجودہ حثیت کو برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے مگر نیو مارکیٹ اکانومی نے اس کو بھی نچلے طبقات کی طرف پچھاڑنے کا کام تیز کر دیا ہے یہی وجہ اس کی موجودہ بدحواسی اور مایوسی کی بنیاد ہے۔

قوم پرست دھڑوں کی قیادت بھی باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے پاس ہے جن کا ماضی صرف کچھ سینکڑوں سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ جدید سندھی قوم پرستی کے ایک بڑے نام یا سکول آف تھاٹ کے بانی صرف دو نسل پہلے ہی پنجاب سے سندھ وارد ہوئی تھی اور وہ بھی تاریخی طور پر عرب نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ قوم پرست دھڑوں کے پاس پریشر پالیٹکس یا جذباتی نعرہ بازی کے سوا کوئی طاقتور پروگرام نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں میں اپنی جڑیں مضبوط نہ کر سکے۔ قوم پرست قیادت خود تاریخی لحاظ سے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے وادی سندھ کی حقیقی تاریخ میں اپنا وجود نہیں ڈھونڈ رہی اس لیے انہوں نے اپنی خواہشات کے مطابق لکھی ہوئی تاریخ کو پروان چڑھایا اور جذباتی نعرہ بازی اور علاقائی میڈیا پر غالب اکثریت کی بدولت حقیقی تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کرنا شروع کر دیا ہے۔ نسلی اور لسانی نفرت اور تعصب کو ابھارنے میں کچھ لوگوں کا کردار بھی ایسا رہا ہے جن سے مقتدر طبقات کو ہی فائدہ پہنچا اور محنت کش طبقات کے فطری اتحاد کو کاری ضرب لگی۔ نسلی اور لسانی تعصب اب دم توڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ آج کے اس جدید دور میں اس قسم

کی تنگ نظر قوم پرستی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

قوم پرستوں نے سندھ میں زبان اور نسل کے تضاد پر اپنی سیاست کو پروان چڑھایا اور یہ ایک ایسا عمل تھا جیسے کوئی بھوک زدہ اور اعصاب شکن بھیڑیا بھوک کی کیفیت میں اپنے اعضا کو نوچ کر اپنی بھوک ختم کرے مگر یہ کاوش اس کی زندگی ہی ختم کر سکتی ہے۔ ناعاقبت اور تنگ نظر سوچ رکھنے والے قوم پرست حلقوں نے لسانی اور نسلی تضاد کو اتنی ہوا دی کہ آج یہی تضادات ان کے لیے موت کا پروانہ بن چکے ہیں۔ جہاں ایک طرف اگر انڈیا ، پاکستان اور بنگلہ دیش کے حکمران ایک قوم بنانے میں ناکام ہوئے ہیں وہیں دوسری طرف قوم پرست بھی اپنے علاقوں کے محروم لوگوں کو یکجا کر کے ایک قوم ثابت کرنے میں ناکام ہوئے ہیں۔

آج ہم کلاسیکل سرمایہ داری کے دور میں نہیں رہتے بلکہ یہ دور کارپویٹ سرمایہ داری کا ہے جس کی سامراجی شکل اس کرہ ارض کے انسانوں کو دن بدن نگلتی جارہی ہے۔اس دور میں قومی بنیاد پر آزاد معیشت کے نظام کی بنیاد رکھنا ناقابل عمل ہوتا جارہا ہے۔ پاکستان کے محنت کش طبقات کی نجات صرف اور صرف ملک گیر اتحاد میں ہے جو محنت کش طبقات کے عالمی اتحاد کا حصہ ہو۔

## دلت کیا چاہتے ہیں؟

دلت اس ملک کا انتہائی پسماندہ طبقہ ہیں۔صدیوں سے سماجی،معاشی وسیاسی جبر کے استحصال کے شکار دلتوں کو اس مذہبی بنیاد پرست ریاست میں دیوار سے لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہندو جاتی کے لوگ تو انڈیا چلے گئے مگر دلتوں نے اپنی دھرتی کو چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔دلت محبّ وطن اور پاکستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

حکمراں طبقہ اور ریاستی قوتیں دلتوں کو اپنی پراکسی جنگ کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتی ہیں مگر حقیقی معناؤں میں دلت طبقے کے حقوق کو محفوظ نہیں کیا گیا۔ دلت قوم پرست ڈاکٹرائن کو مسترد کرتے ہوئے پاکستان کے محنت کش طبقات کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ تمام محنت کش طبقات کی طرح دلتوں کی نجات بھی سوشلسٹ انقلاب میں ہے۔ ایک سوشلسٹ انقلاب ہی صدیوں کے جبر کا انتقام ہوسکتا ہے اور اس غیر فطری اور انسان دشمن نظام، ریاستوں اور حکمران طبقوں کے آلہ کاروں والی قوم پرستی کے ہتھکنڈوں کا موثر جواب بھی۔

# سندھ: تصوف، قوم پرستی اور سوشلزم کی تکون اور حقیقی حل

ہماری ایک بہت عزیز دوست کہتی ہیں کہ سندھ میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے پھیلاؤ کی ذمہ داری سوشلسٹوں پر بھی عائد ہوتی ہے کیوں کہ انہوں نے ہمیشہ سندھ کے صوفیاء اور دھرتی شاعروں، کنور بھگت رام، صوفی شاہ عنایت، شاہ لطیف بھٹائی، سچل سرمست وغیرہ اور قوم پرست رہنماؤں مثلاً جی ایم سید، کا ٹھٹہ اڑایا ان کی مخالفت کی۔ جس کے نتیجے میں سندھ میں صوفی روایت کمزور پڑی ہے. ان کے مطابق سندھ کے مسائل کا حل تصوف اور قوم پرستی کی جانب واپس لوٹنے میں ہے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ جب یہ ''حقائق'' سوشلسٹوں کے سامنے لائے جاتے ہیں تو وہ انہیں تسلیم کرنے کے بجائے فرار کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

گزارش یہ ہے کہ سوشلسٹ عموماً تصوف پر یقین نہیں رکھتے لیکن میں نے اپنی تمام عمر میں آج تک کوئی ایک ایسا سوشلسٹ نہیں دیکھا جو صوفیاء کا یا دھرتی شاعروں کا مذاق اڑائے۔ البتہ میں ایسے بہت سے سوشلسٹوں یا مارکسسٹوں سے واقف ہوں جو صوفیا کے

خیالات اورخصوصا ان کی شاعری کے مداح اس لیے ہیں کہ ان میں انسان دوستی کے اور ملائیت اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف عمدہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ان میں سے بعض خودصوفیت کے احیاء کی تحریک چلانے کے خواہش مند بھی ہیں.

شاہ لطیف اور سچل سرمست کے بے شمار مداح سوشلسٹ ہیں. شاہ لطیف کا اردو ترجمہ کرنے والے ایک سوشلسٹ ٹریڈ یونین لیڈر سے میں ذاتی واقفیت رکھتا ہوں۔

صوفی شاہ عنایت شہید کو سوشلسٹ سندھ دھرتی کا پہلا کمیونسٹ سمجھتے ہیں اور ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔انہوں نے سندھ کے ظالم سندھی حکمرانوں کی جانب سے سندھ کے سندھی کسانوں پر ظلم کے خلاف مسلح جدوجہد کی اور اس جہدِ عظیم میں شہید ہوئے۔

کنور بھگت رام مسجد منزل گاہ پر ہندو مسلم بلوے میں جان بحق ہوئے۔ڈاکٹر در محمد پٹھان کے بقول منزل گاہ کے واقعے کی ذمہ دار سندھ مسلم لیگ تھی جس کے کلیدی رہنما حاجی عبداللہ ہارون (سرمایہ دار) جی ایم سید (پیر) اور ایوب کھوڑو (جاگیردار) تھے جن کا مقصد بقول ڈاکٹر در محمد پٹھان سندھ کے سندھی ہندوؤں اور سندھی مسلمانوں کے درمیان مذہبی تفریق پیدا کر کے سومرو حکومت کو ختم کر کے مسلم لیگ کی حکومت قائم کرنا تھا۔

سندھ میں قوم پرستی کی تحریک پاکستان کے قیام کے بعد سے موجود ہے اور سندھ کی سب سے گہری سیاسی، سماجی اور ثقافتی تحریک ہے لیکن اب تک سندھ کی قوم پرست تحریک سندھ کی اکثریتی آبادی یعنی سندھ کے سندھی کسان اور سندھی مزدوروں کو سندھ کے ظالم و جابر سندھی وڈیروں اور سندھی سرمایہ داروں کے ظلم و جبر سے آزادی کے لیے کچھ نہیں کرسکی۔چمبڑ میں سندھی آبادگاروں کی ایک میٹنگ میں ایک سندھی آبادگار کے یہ جملے اس خاکسار کے کانوں میں ابھی تک گونجتے ہیں کہ ''جو وڈیرہ میری زمین کا پانی چراتا ہے وہ بھی سندھی ہے۔مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آخر یہ سندھی قوم پرستی کس چیز کا نام ہے؟''

سندھ کے بیسیوں لاکھوں سندھی کسان اور سندھی مزدور اپنی ہی قوم کے وڈیروں اور سرمایہ داروں کے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ کیا سندھ کے لاکھوں کسان اور مزدور سندھی نہیں ہیں، سندھی قوم کا حصہ نہیں ہیں؟

ان کے حق اور آزادی کی آواز سندھ کے سوشلسٹوں نے اٹھائی۔ حیدر بخش جتوئی کو سندھ کے سندھی وڈیروں نے درختوں سے باندھ کر مارا، سندھی کسانوں پر اپنے حق کی جدوجہد کرنے کی پاداش میں کتے چھوڑے گئے، مائی بختاور سندھ ہاری تحریک کی پہلی شہید عورت بنی لیکن سندھ کے کسان سندھ اسمبلی کے سامنے دھرنا دے کر سندھ ٹیننسی ایکٹ منظور کروانے میں کامیاب ہوگئے۔ سندھ کے قوم پرست سندھ میں زرعی اصلاحات کا سوال اٹھانے اور سندھ کے کسانوں کو ان کا حق دلوانے کے لیے مہم چلانے پر راضی نہیں ہیں۔

سندھ کے مزدوروں کو منظم کرنے، ان کی ٹریڈ یونین بنانے، ان کو سیاست میں لانے کا مقدس ترین جمہوری فریضہ بھی سندھ کے سوشلسٹوں نے انجام دیا۔ عزیز سلام بخاری سے لے کر نذیر عباسی تک یہ سوشلسٹ تھے جو سندھ کے جمہور، سندھ کی اکثریتی آبادی کے حق کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر گئے اور جان پر کھیل گئے۔ سندھ کے قوم پرستوں کی طرح نہ ان کے پاس بنگلے تھے اور نہ ڈبل کیبن بیش قیمت گاڑیاں اور نہ اردگرد ملازموں کے جتھے۔

سندھ کی جمہوری طلبا تحریک کی بنیاد بھی سندھ کے سوشلسٹوں نے رکھی۔ سندھی قوم پرستوں نے طلبہ تحریک کو غنڈہ گردی، اوباشی، بدمعاشی، منشیات فروشی جیسی لعنتوں کا شکار بنا دیا۔

سوشلسٹ، قوم پرست نہیں ہوتے، قوم ملکیتی اور غیر ملکیتی طبقوں میں بٹی ہوتی

ہے۔قوم پرستی میں طبقاتی جدوجہد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کیوں کہ قوم پرستی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قوم کو ایک کل تسلیم کیا جائے اور اس میں موجود طبقاتی تقسیم کو نظر انداز کیا جائے۔قوم کے اندر موجود ظالم اور مظلوم طبقے کے فرق کو رد کرتے ہوئے قوم کے ہر فرد سے یکساں محبت کی جائے۔سوشلسٹ بین الاقوامیت پسند ہوتے ہیں۔وہ ہر قوم کے مظلوم طبقے کے حمایتی اور ظالم طبقے کے مخالف ہوتے ہیں۔وہ ہر قوم کے محنت کش طبقے کو دوسری قوم کے محنت کش طبقے سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر قوم کے محنت کش طبقے کو اپنی قوم اور ساری قوموں کے ظالم طبقے کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرتے ہیں۔سوشلسٹ ظالم قوم کے خلاف مظلوم قوم کی جدوجہدِ آزادی اور خود اختیاری کے علم بردار ہوتے ہیں لیکن قومی آزادی کی جدوجہد میں وہ کبھی قوم پرست نہیں بنتے بلکہ اپنی قوم کے اندر موجود ظالم طبقے کے خلاف مظلوم طبقے کی آزادی کے لیے بھی مستقل لڑتے ہیں۔

قوم پرست اپنی قوم کے مظلوم طبقے کا استحصال جاری رکھنے اور اسے چھپانے کے لیے مظلوم طبقے کو قوم پرستی کا، قومی محبت اور یگانگت کا فریب دیتے ہیں تا کہ قومی بھائی چارے اور قومی ہم آہنگی کے پرفریب خیالوں سے متاثر ہو کر مظلوم طبقے کے لوگ اپنی ہی قوم کے ظالم طبقے کے ظلم کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں، آواز نہ اٹھا سکیں۔

قوم کے اندر موجود ظالم طبقہ، ایک زبان، ایک ثقافت، ایک تاریخ، ایک علاقے، کے نعروں کو قوم کے اندر موجود مظلوم طبقے کو اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم اور استحصال کو برداشت کرنے یا اس ظلم کے خلاف ان کے اندر پیدا ہونی والی نفرت، غم و غصے اور بغاوت کو دوسری قوم کے لوگوں کی جانب منتقل کرنے کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔

سندھ کے ہزاروں شہری وفاقی ریاستی اداروں میں کام کر رہے ہیں. صوبائی حکومتی اداروں میں سندھ کے شہریوں کی کثیر اکثریت ہے۔ پیپلز پارٹی سندھ کی نمائندہ سیاسی جماعت ہے جو وفاقی حکومت میں رہی ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے سندھ کی یہ نمائندہ جماعت صوبائی حکومت میں ہے۔ کئی سندھی طلباء وفاقی یونیورسٹیوں میں بشمول پنجاب تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سندھی قوم پرست سیاسی جماعتیں کبھی سندھ کے عوام کی اکثریت حاصل نہیں کر سکیں۔ اگر سندھ کے آدھے بچے اسکول نہیں جاتے یا سندھ کے اسکولوں میں سندھی ٹیکسٹ بک موجود نہیں، اگر سندھ کے اسکول تباہ حال ہیں، ان میں گھوسٹ ٹیچر ہیں، ان میں کوئی بنیادی سہولت موجود نہیں، اگر سندھ میں غریب عورتوں اور بچوں کی کثیر اکثریت خوراک کی کمی کا شکار ہے، اگر سندھ کا ہاری یا کھیت مزدور بھوکا مر رہا ہے، اگر سندھ کا مزدور فاقہ کشی اور بیروزگاری کا عذاب سہہ رہا ہے، اگر سندھ کے نوجوان کو بغیر رشوت نوکری نہیں مل رہی تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سندھ کے سندھی سیاست دان، وفاقی اور صوبائی حکومت کے مزے لوٹنے والے سندھی، کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کرنے والے سندھی جاگیردار، زمیندار اور سرمایہ دار یا پنجاب سامراج؟ (نوٹ: اس میں ایم کیو ایم بھی شامل ہے)۔ پنجاب "سامراج" کی وفاقی دست درازیوں پر کمپرومائز کرنے والا کون ہے؟ کس نے سندھ کے سیاسی اور حکومتی نمائندوں کو سندھ کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ کو روکنے سے روکا ہے؟ کیوں ان میں اتنی ہمت و جرأت نہیں کہ یہ سندھ کے وسائل پر وفاقی دست درازیوں کو روک سکیں؟ فیدل کاسترو ہمارے سندھی سوشلسٹوں کا ہیرو ہے۔ کاسترو نے کس کے خلاف لڑائی کی تھی؟ بتستا کیوبن قوم کا فرد تھا یا امریکی قوم کا؟ بتستا کی فوج، کیوبا کے جاگیردار اور سرمایہ دار اور کیوبا کی بیوروکریسی امریکی قوم کا حصہ تھی یا کیوبن قوم کا حصہ؟ کاسترو نے اپنے گھر کے اپنی قوم کے استحصالیوں کے خلاف لڑائی کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں

جنہوں نے کیوبن ''قوم'' کوامریکی سامراج کا غلام بنائے رکھا ہے۔ ہمارے "سوشلسٹ" رفیق مشورہ دیتے ہیں کہ لینن کو پڑھو۔ ہم کہتے ہیں جناب والا قوم پرستی، قومی کلچر وغیرہ پر لینن کو پڑھ کر تو دیکھیں آپ کے کانوں سے دھویں چھوٹ جائیں گے! لینن تو اس حق میں بھی نہیں تھا کہ تعلیم "صوبائی" اختیار میں دی جائے! لینن کے ہی الفاظ ہیں کہ ہم " کسی بھی قسم کی قوم پرستی" کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لینن ہی تھا جس نے کانسٹی ٹیوشنل ڈیموکریٹوں کے " کلچر" کی دھجیاں اڑادی تھیں! ایملکار کیبرال کے بھی ہمارے "سوشلسٹ" دوست فین ہیں۔ ہمیں بتاتے ہیں کہ کلچر اور قومی آزادی پر کیبرال کو پڑھو تاکہ تمھاری نادانی دور ہو! اچھا! کیبرال کے ملک گنی پر پرتگالی سامراج کا قبضہ تھا۔ پرتگال کی فوجیں گنی اور کیپ ورڈے میں موجود تھیں اور وہاں کے لوگوں پر بندوق کے زور پر ظلم وستم ڈھاتی تھیں۔ کیا سندھ میں بھی یہی صورتحال ہے؟ کیبرال نے قومی آزادی پر صرف "لیکچر" نہیں دیے تھے بلکہ آزادی کے لیے مسلح فوج تیار کرکے مسلح جنگ لڑی تھی۔ سندھ کے حالات میں ایسا کیا ہے جو ہم کیبرال کی کلچر اور قومی آزادی کی سمجھ بوجھ اور جدوجہد کے طریقوں کو یہاں لاگو کریں؟ آخر ہم "سوشلسٹ" کب تک سندھ میں طبقاتی جدوجہد کو پنجاب "سامراج" اور "قومی آزادی" کے کھاتے میں ڈال کر سندھ کے استحصالی طبقے کا تحفظ کرتے رہیں گے اور سوشلزم/کمیونزم کی ذیل میں کلچر کے تحفظ کے نام پر "قومی یکجہتی" یعنی "طبقاتی یکجہتی" کو فروغ دیتے رہیں گے؟

تصوف ظالم طبقے کو مظلوم طبقے پر ظلم کرنے سے نہیں روک سکتا۔ سندھ کے وڈیرے، سرمایہ دار اور بیوروکریسی سندھ کے صوفیا کے خیالات اور شاعری سے ناواقف نہیں ہیں۔ صوفیانہ کلام کہیں بھی ان کے طبقاتی مفاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ صوفیانہ کلام سندھ کے محنت کشوں کو طبقاتی جدوجہد اور انقلاب کے لیے آواز نہیں دیتا۔ صوفیانہ کلام

مذہبی انتہا پسندی کے خلاف رواداری اور مذہبی ہم آہنگی کو تقویت ضرور دے سکتا ہے لیکن یہ معاشی مسائل کو حل کرنے کا کوئی راستہ فراہم نہیں کرتا۔ سندھ کے محنت کش عوام کا استحصال اس وقت بھی جاری تھا جب سندھ میں مذہبی انتہا پسندی موجود نہیں تھی۔ تصوف کوئی معاشی-سیاسی فلسفہ نہیں ہے۔

سندھ میں مذہبی انتہا پسندی کی لہر اسٹیبلشمنٹ اور سندھ کے حکمران طبقے کے مفادات کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ سندھ کی وڈیرہ شاہی اور اس کی معاون فوجی مقتدرہ سندھ میں مذہبی انتہا پسند اور دہشت گرد قوتوں کو منظّم کرنے میں ملوث ہے۔ سیاسی حکومت اس خطرناک عمل کو روکنے سے لاچار اور ان کی سہولت کاری پر مجبور ہے۔

عرض یہ ہے کہ سندھ کے مسائل کا حل نہ ہی تصوف ہے اور نہ قوم پرستی۔ تصوف کے ذریعے ریاست کی جانب سے منظّم کردہ مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں، یہ سیاسی معاملہ ہے۔ سندھ کے مسائل کو حل کرنا تو کجا، قوم پرستوں نے سندھ کی صورتحال کو خراب تر کیا ہے۔ سندھ کے مسائل کو طبقاتی جدوجہد کے ذریعے ہی حل کیا جا سکتا ہے اور طبقاتی جدوجہد کے نزدیک سندھ کے حقیقی مسائل وہ مسائل ہیں جن کا تعلق سندھ کے محنت کش طبقوں سے ہے۔ مڈل کلاس طبقے کی قوم پرستانہ جذباتیت بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے، مسائل کا حل نہیں۔

مڈل کلاس ظالم اور مظلوم طبقے کے درمیان میں کھڑی ہے اور تذبذب کا شکار ہے۔ یہ اپنی بقا کے لیے ظالم طبقے کی دی گئی معاشی مراعات پر انحصار کرتی ہے اس لیے اس کی جانب جھکتی ہے۔ لیکن مظلوم طبقے کے دگرگوں حالات سے پیدا ہونے والی سماجی ابتری سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ یہ سماج کو اس انتشار کی کیفیت سے نکالنے کے لیے ظالم اور مظلوم طبقوں میں "بھائی چارہ اور قومی ہم آہنگی" قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کے لیے لے دے کر

اس کے پاس سوائے "قوم پرستی" کے کھوکھلے نعروں کے سوا کچھ نہیں بچتا جس کے ذریعے یہ سماجی برابری، مساوات اور انصاف کے آدرشوں کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ سماج میں حقیقی طور پر موجود طبقاتی تضاد کو قوم پرستی کی خیالی خواہشوں اور جذباتیت سے ختم کرنے کے خواب دیکھتی ہے۔

# شناخت کی سیاست اور ہمارا نکتہ نظر

شناخت کی سیاست کیا ہے اور اس کا آغاز کن مقاصد کو لے کر شروع ہوا ترقی پسند تحریک کے لیے اس کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند سیاسی تحریک جہاں اور بہت سے فکری مغالطّوں کا شکار رہے وہاں 1980ء کی دہائی کے بعد پوسٹ ماڈرن ازم کے بطن سے جنم لینے والے سیاسی پاپولزم نے بھی ترقی پسند سیاسی نقطہ نظر اور طبقاتی نظریئے کی تحریک کو کافی زک پہنچائی ہے۔ عام طور پر سیاسی پاپولزم جو کہ مختلف شناختوں کی بنیاد پر جنم لیتا ہے اپنی طرف مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس کی پرتوں کو متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس میں سے جنم لینے والا یہ پاپولزم کسی حد تک محنت کش طبقہ کی صفوں میں بھی سرایت کر کے محنت کش طبقے کی یونٹی اور شناخت کو مندمل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس موضوع پر اپنی بات کو مزید گہرائی کی طرف لے جائیں بہتر ہوگا کہ ہم شناخت کی سیاست اور شناخت سے کیا مراد ہے پر کچھ وضاحتیں پیش کر دیں تا کہ آگے چل کر قاری کے لیے موضوع کے فہم کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

شناخت کی سیاست سے مراد ہے کہ کسی بھی شخص/فرد کو اس کی شناخت کی بنیاد پر تسلیم کیا جائے اور سیاست میں اسے اس کی تسلیم شدہ شناخت کی بنیاد پر متحرک کیا جاسکتا ہے اور متحرک کیا جانا چاہیے۔ شناخت کی سیاست کے نزدیک ایک انسان کی مختلف شناختیں ہوسکتی ہیں لیکن اس کی شناخت وہی ہوگی جس کے ساتھ وہ اپنی شناخت تسلیم کروائے۔ مثال کے طور پر کوئی بھی شخص مرد بھی ہوسکتا ہے کھیت مزدور بھی اور دلت بھی۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھے کہ اُس کی ذات اُس کی شناخت ہے تو اُس کو اس کی ذات کی بنیاد پر ہی متحرک کیا جاسکتا ہے نہ کہ اس کی ورکر شناخت یا کام کی بنیاد پر۔ شناخت کی سیاست اختلافات اور علیحدگی پر زور دیتی ہے تاکہ منفرد شناختوں کو اُبھارا جائے جس سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آنے اور اپنی مشترکہ شناخت پر متحرک ہونے کی بجائے اپنی مختلف شناختوں (رنگ، نسل، لسان، قومیت، برادری، مذہب، فرقہ وغیرہ) کی بنیاد پر متحرک رہیں اور ریاست کے ساتھ مطالبہ بازی تک محدود رہیں۔ اس لیے شناخت کی سیاست بنیادی طور پر سماج میں کسی مشترکہ شناخت کی بنیاد پر جدوجہد کو تقسیم کر کے مختلف شناختوں میں بانٹنے کا کام کرتی ہے۔ عمومی طور پر شناخت کی سیاست کے علمبردار سماج میں رنگ، نسل، زبان، قومیت، جنس، مذہب، فرقہ اور برادری یا اس طرح کے کسی بھی دوسرے فرق کو تسلیم کرنے پر اپنا سارا زور دیتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی شناخت نظر نہیں آتی تو وہ شناخت ہے طبقے کی شناخت، ذرائع پیداوار کے مالک اور بے مالک طبقات کی شناخت، Have اور Have Not کی شناخت۔ اگر ہم اپنی سہولت کے لئے شناخت کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں تو دو خانے واضح ہو جائیں گے۔ یعنی کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی سماج میں انسانی شناخت یا تو ذرائع پیداوار اور آلات پیداوار سے جنم لیتی ہے یا پھر سماجی سٹرکچر اور دوسری قدرتی وجوہات سے جنم لینے والی شناخت۔ مثال کے طور پر کسی کا رنگ کالا ہے یا گورا اس کا تعلق موسمی، علاقائی، نسلی حوالوں

سے ہے، جو کہ اس انسان کے اپنے بھی بس میں نہیں ہے۔ اسی طرح سے جنس کا معاملہ ہے۔زبان کا معاملہ ہے۔

شناخت کی سیاست کے علمبردار بنیادی طور پر سماج میں کسی بھی وجہ سے ظاہری طور پر پائے جانے والے فرق کو بنیاد بنا کر سیاست کو ترجیح دیتے ہیں اوراس طرح سے اُس سماجی گروہ کو مشترکہ جدوجہد سے باہر نکال کر ریاست کے کام کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس ساری صورتحال کی منظر کشی ہمیں پاکستان میں ہونے والی سیاست میں باخوبی نظر آرہی ہے۔نسل، ذات، زبان، قومیت، مذہب، فرقہ اوراب دلت کے نام پر ہونے والی سیاست ہمارے سامنے ہے۔

شناخت کی سیاست کے علمبردار فرق کے اتنے دلدادہ ہیں کہ اگر ان کو کوئی فرق نظر نہ آرہا ہوتو زبانوں کے مختلف لہجوں (Dialects) کی بنیاد پر سیاست استوار کرنا ہمارے سامنے ہے۔غرض کہ شناخت کی سیاست سماج میں نظر آنے والے یا نہ آنے والے کسی بھی فرق کو تو ابھارتی ہے لیکن اگر نہیں ابھارتی تو وہ طبقاتی شناخت ہے۔

## شناخت کی سیاست کا تاریخی پس منظر

1980ء کی دہائی میں سامراجی گلوبلائزیشن کی ایجاد ہوئی جس کے پیچھے گلوبل فنانس کیپیٹل نے فیول فراہم کیا۔اس سامراجی گلوبلائزیشن اور گلوبل سرمائے کی نقل و حمل کو نئی سائنسی ایجادات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بھی خوب قوت فراہم کی۔ عالمی سرمایہ داری کے اس دور میں سوشلزم کو سوویت یونین کی اتھل پتھل نے بھی شدید دھچکا لگایا اور عالمی سطح پر اس تصور کو بھی شدید دھچکا لگا کہ لوگ سرمایہ داری نظام کو گرا کر اس استحصال سے جان چھڑا سکتے ہیں۔سوشلزم کو دھچکا لگنے کی وجہ سے لسانی، قومیتی اور نسلی شناختوں کی سیاست نے خوب زور پکڑنا شروع کر دیا۔ یہی سب کچھ ایک فیشن کی مانند بالکان، مشرقی یورپ اور سابق

سوویت یونین کی ریاستوں میں جنم لینے لگا۔

فنانس کیپیٹل کی ایجاد اور سوشل ازم کی کمزوری نے شناخت کی سیاست کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ لسانی شناخت کی سیاست ہی تھی جس نے یوگوسلاویہ کی ریاست کے ٹوٹنے کا عمل تیز کیا۔ سلاوینیہ، کروشیا کی تخلیق، بوسینا میں جنگیں اور یوگوسلاویہ کا مختلف نئی ریاستوں میں تقسیم ہونا شناخت کی سیاست کا عالمی سطح پر پھیلنے کا ثبوت ہے۔ مالیاتی اور یورپی سرمایہ نے سابق سوویت یونین کی مختلف قومیتوں کے درمیان مختلف تنازعات کو National Anatoganism کے نام پر ہوا دی اور نئی بننے والی منڈیوں میں اپنی شمولیت کو یقینی بنایا۔ سابق سوویت یونین کی اتھل پتھل اور نئی ریاستوں کی تخلیق دراصل ان ریاستوں کے اندر مارکیٹ اکانومی کو استوار کرنے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ عالمی مالیاتی سرمایہ ملٹی پل شناختوں میں منتشر لوگوں کے ساتھ ڈیل کرنا اپنے لیے زیادہ آسان دیکھتا ہے۔ یہ اُس کے لیے آسان ہے کہ وہ مارکیٹ اکانومی کو نئی ریاستوں میں شامل کرے اور ان کا کنٹرول حاصل کرے۔

کنزومرازم اور منڈی مختلف گروپوں کو اپنے اندر شامل کرتی ہے اور ان کی مختلف شناختوں کو ابھارا جاتا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے قریب آنے کی بجائے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہوں اور سرمایہ کے استحصال اور منڈی کی برتری کو چیلنج نہ کرسکیں۔ سرمایہ دارانہ ریاست اور سامراجی گلوبلائزیشن کے لیے ایک سے زیادہ شناختوں پر مبنیٰ گروپ زیادہ آسانی سے سنبھالا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان کو عالمی یکجہتی کے بینر تلے ایک کرنا اور یہ مطالبہ کرنا کہ معاشی پیداوار اور قدرزائد کی تقسیم برابری کی بنیادی پر کی جائے ایک مشکل ٹاسک بن جاتا ہے۔ سرمایہ داری کی اس گلوبل شکل نے پوسٹ ماڈرن ازم کو اپنی ڈھال کے طور پر استعمال کررہی ہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم کو پوسٹ مارکسسٹ تھیوری کے

طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اسی پوسٹ ماڈرن ازم نے شناخت کی سیاست کو بنیادیں فراہم کیں ہیں۔

## پوسٹ ماڈرن ازم کیا ہے؟

پوسٹ ماڈرن ازم ایک بورژوا فلسفیانہ اظہار ہے جو کہ 20 ویں صدی کی آخری دھائی میں سرمایہ داری کی جیت اور سوشلزم کی وقتی پسپائی کے نتیجے میں ابھر کے سامنے آئی۔ یہ مارکس ازم اور لینن ازم کی نفی ہے۔ یہ اس اعلیٰ احساس کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے کہ ترقی پسندی اور روشن خیالی مردہ اور ختم ہوگئی ہے۔ پوسٹ مارڈن ازم نے ترقی پسندی کی تمام قدروں پر سوال اٹھایا اور اس فلسفہ اور سیاست کو مسترد کیا جو کہ Universal (عالمی) اور Totalising پر مبنیٰ تھی۔ پوسٹ مارڈرن ازم نے تمام Totalising تھیوریوں کو Meta Narratives کہہ کر مسترد کر دیا۔ پوسٹ ماڈرن ازم کے نزدیک تمام اس طرح کی تحریکیں جو کہ آزادی کے عالمی اور یونیورسل پر انحصار کرتی ہیں وہ دراصل نئی طرح کے جبر اا ور استحصال کا سبب بنتی ہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم سرمایہ داری اور سوشلزم کو ایک نظام اور ڈھانچہ کے طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ پوسٹ ماڈرن ازم صرف شناختوں کے مجموعہ، اختلافات اور تنازعات کو تسلیم کرتا ہے اور ان کو ابھارتا ہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم اپنے آپ کو انقلابی سماجی نظریہ کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ سرمایہ داری کو چیلنج نہیں کرتا یہ بورژوا نظریوں کا متبادل نہیں ہے بلکہ یہ مارکس ازم کو Counter کرنے کیلئے ایک میزبان کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور ایک ایسی سیاست کو ترجیح دیتا ہے، جس سے سرمایہ داری نظام کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ یہ پوسٹ ماڈرن ازم اور پوسٹ مارکس ازم ہے یہاں سے شناخت کی سیاست جنم لیتی ہے۔ پاکستان آج پوسٹ ماڈرن ازم کی اس سیاست کا جتنا شکار ہے شائد ہی کوئی معاشرہ ہو۔ جہاں ورکنگ کلاس یونٹی کو جس قدر اس سیاست نے تقسیم کیا ہوا ہے

شائد ہی کہیں اور ہو۔ پاکستانی سماج میں تقسیم کی عمودی لائنیں دن بدن گہری ہو رہی ہیں اور افقی لائنیں اس قدر مندمل ہو چکی ہیں کہ کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ سماج لسانی، مذہبی فرقہ وارانہ، نسلی، برادری ازم، علاقیت اور قومیتی حوالوں سے اس قدر منقسم نظر آتا ہے کہ طبقاتی تقسیم اور طبقاتی سیاست کہیں نظر ہی آتی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ طبقاتی سیاست کے علمبردار بھی اس سیاست کی بھول بھلیوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔

## کیا سماجی شناختیں سماج میں استحصال کا ذریعہ بنتی ہیں؟

عام طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ جب سماجی شناختیں سماج میں استحصال کا سبب بنتی ہیں تو پھر کیوں نہ ان شناختوں کو تسلیم کیا جائے اور ان کی بنیاد پر استحصال کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صرف سماجی شناختوں کی بنیاد پر استحصال نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ اور موقعوں پر کئی مخصوص سماجی شناختوں کی بنیاد پر استحصال کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مزدور کا بھی استحصال ہوتا ہے اور اگر ہمارے ملک کے اندر وہی مزدور کسی اقلیت یا نچلی ذات سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا استحصال شاید اس سماجی شناخت کی بنیاد پر بھی ہوتا ہو۔ اسی طرح کی صورتحال بعض دفعہ چند نامساعد حالات کی وجہ سے بعض دوسری سماجی شناختوں کی صورت میں بھی سامنے آسکتی ہے۔

## کیا کیا جائے (What is to be done)؟

اس حوالے سے ہمیں شناخت کی سیاست کے علمبرداروں کے چنگل سے بچنا ہوگا اور بائیں بازو کی انتہا پسندی سے بھی کیونکہ ہمارے بائیں بازو کے بعض علمبردار بھی بعض اوقات صرف طبقاتی شناخت کی بنیاد پر استحصال پر زور دیتے ہیں اور دوسری سماجی شناختوں کی بنیاد پر استحصال کو رد کرتے ہیں۔ اس حوالے سے درست مارکسسٹ لیننسٹ نقطہ نظر یہی ہے کہ ہم سماج میں ہر طرح کے استحصال کے خلاف آواز بلند کریں اور ہر جگہ اس کی نفی

کریں خاص طور پر اپنی تنظیم کے اندر ایسا ماحول تشکیل دیں کہ یہاں ہر قسم کے سماجی تعصّبات سے پاک رشتے قائم ہوسکیں اور تنظیم کے اندر ان نچلی ذاتوں کے ساتھیوں کو اپنی قیادت کا حصہ بنانا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں جو بات اپنے سامنے مدنظر رکھنی ہے کہ سماجی شناختوں اور تعصّبات کی بنیادیں مادی ہوتی ہیں اور کسی انسانی گروہ کے اندر کسی دوسرے انسانی گروہ کے متعلق مثبت اور منفی خیالات کا پیدا ہونا دراصل اردگرد کے سماجی ماحول پر منحصر ہوتا ہے جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ مارکس نے بھی کہا تھا کہ

> "To me the idea is nothing else than material world reflect in the human mind"

اس لیے ان سماجی خیالات کی تبدیلی اس وقت ہی ممکن ہوسکتی ہے جب ہم مادی دنیا کو تبدیل کریں گے۔ مادی دنیا کی تبدیلی کیلئے ضروری ہے کہ معاشی ڈھانچہ کی تبدیلی کی جدوجہد کو فوکس بنایا جاے جہاں سے سماجی ڈھانچہ مرتب ہوتا ہے اور سماجی خیالات پروان چڑھتے ہیں۔ اس لیے سماجی تعصّبات کا خاتمہ اپنی آخری اور فیصلہ کن شکل میں اس وقت ممکن ہے جب ہم اس معاشی ڈھانچہ کو تبدیل کریں گے۔ معاشی ڈھانچہ کو تبدیل کیے بغیر سماجی خیالات کو تبدیل کرنے کا خواب رکھنے والا احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔

# پاکستان میں قومی سوال

قومی سوال بائیں بازو کی سیاست میں ہمیشہ ہی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ خاص طور پر تیسری دنیا کے ملکوں میں جہاں نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ یا آزادی ترقی پسند تحریکوں کی شکل میں نہیں ہوئی۔ پاکستان اور انڈیا اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کا بائیں بازو پاکستان بننے کے فوری بعد زیرِ عتاب آ گیا تو بائیں بازو انتشار کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی کی شکل میں پاکستانی بایاں بازو اپنی شناخت بنانے میں مصروف تھا کہ NAP روس، چین نظریاتی جھگڑا کے باعث تین حصوں میں میں تقسیم ہو گئی اور پھر اسی اثناء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بننے کی طرف گیا اور بن گیا۔ چنانچہ باقی ماندہ پاکستان میں یہ سوال اور بھی زیادہ شدت سے ابھرا اور بلوچستان میں آزادی کیلئے گوریلا کارروائیاں بھی عمل میں آئیں۔ ایسے میں منتشر شدہ بائیں بازو اس اہم مسئلہ پر بھی انتشار کا شکار ہوا اور عجیب طرح کی ذومعنی حکمت عملیاں، سیاسی مؤقف اور پینترے بدلتا رہا۔ جس سے مسئلہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھنے کی طرف گیا۔ بعض بائیں بازو کے گروہ پاکستان کو ایک

ملک یا ریاست کے طور پر شروع دن سے ہی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں رہے۔اس لیے ان کی حکمت عملیوں اور سیاسی موقعفوں نے قومی سوال کی ہیت اور سمجھ بوجھ کو مزید الجھا دیا۔ ملک یا ریاست سے بیزاری کا اظہار ان بائیں بازو کے حضرات کی سیاست میں مزید نمایاں شکل اس لیے بھی اختیار کرتا گیا کیونکہ پاکستانی ریاست سرد جنگ میں USSR کے خلاف امریکی سامراج کے کیمپ میں واضح طور پر کھڑی تھی اور اس کے ساتھ عالمی دفاعی نوعیت کے معاہدوں (سیٹو اور سینٹو) کی پرجوش حامی تھی اس لیے امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی ملک کی انتشار پذیری (Disintegration) پر مبنی حکمت عملی اس نوزائیدہ بائیں بازو کیلئے سب سے بڑا انقلابی فرض بن گئی۔اس رویہ اور حکمت عملی پر ہم تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

پاکستان میں قومی سوال کی ہیئت اور طبقاتی تحریکوں کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قوم اور قومی تحریکوں کے ابھرنے کے پس منظر کو سمجھیں اور اس کی روشنی میں پاکستان کے مخصوص حالات میں قومی تحریکوں اور طبقاتی جدوجہد کے حوالے سے لائحہ عمل اپنانے کی طرف جائیں۔

مارکسزم اور لینن ازم قوم کو سمجھنے کی سائنسی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔قوم بنیادی طور پر ایک تاریخی تصور ہے جو کہ سماجی ترقی / نشوونما کی ایک مخصوص سطح پر ابھرتا ہے اور ختم ہوتا رہتا ہے اور نئی شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔قومی ریاست کا تصور یورپ کے اندر اٹھارویں صدی کے مخصوص حالات کے نتیجہ میں سامنے آیا۔ وہ معاشرے جہاں فیوڈل سماج اور پیداواری رشتے رائج تھے وہاں نئی تجارتی کلاس ابھر کر سامنے آئی۔ چنانچہ اس نئی ابھرتی ہوئی بورژوازی کو ایک جیسی مارکیٹ، متحدہ سیاسی وحدت اور مشترکہ زبان کی ضرورت پیش آئی۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری کے اس ابھرتے ہوئے دور میں نئی ابھرنے والی بورژوازی نے قومی تحریک کو لیڈ کیا اور جاگیرداری کو شکست دیتے ہوئے قومی ریاستوں کی بنیادیں رکھیں۔

سرمایہ داری کی ترقی کے نتیجے میں قومیتی گروہ یا مختلف قومیتی گروہ ایک قوم کی شکل اختیار کرنے لگے۔ یورپ میں قوم اور قومی ریاستوں کی تشکیل نے اس راستہ پر چلتے ہوئے تشکیل پائی، جو کہ نوآبادیوں میں مختلف طریقے سے ہے۔ یورپ اور امریکہ میں سرمایہ داری نظام میں زائد پیداوار کی کھپت کیلئے باقی ماندہ دنیا میں منڈیوں کی تلاش کے نتیجے میں کالونیاں بنائی گئیں اور اس طرح ان معاشروں کے اندر سامراج مخالف لڑائی کے نتیجے میں قومی تصور ابھرا۔ برصغیر ہندوستان میں اس سامراج دشمن لڑائی کی وجہ سے ہندستانی نیشنلزم ابھرتا ہے جو کہ بعد میں بعض اندرونی اور بیرونی وجوہات کی وجہ سے مذہب کے نام پر تقسیم بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نوآبادیوں میں سامراجی قبضہ کے خلاف جدوجہد کے نتیجے میں مختلف کلچروں، زبانوں، نسلوں پر مبنی قومیتی گروہ ایک نئے قومی تصور کی طرف رخ کرتے ہیں اور اس میں انہیں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ سامراج مخالف جدوجہد ان سماجوں میں پائے جانے والے معمولی اور غیر معمولی فرق کو ختم کر کے ایک نئے قومی تصور کو جنم دیتے ہیں جو کہ اپنی ریاست میں سامراج دشمن اور جاگیردار دشمن رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ عالمی سطح پر محنت کشوں کی ریاست کا قیام اور جاندار عالمی کمیونسٹ تحریک بھی اس حکمت عملی کی تائید کرتی ہے اور اس سلسلے میں ہر ممکن مدد بھی فراہم کی جاتی ہے چنانچہ تیسری انٹرنیشنل کے فیصلوں کے مطابق کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان قومی آزادی کی تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں اور جمہوری انقلاب اور جدوجہد کو لیڈ کرتے ہیں۔ اسی صورت سے قومی جمہوری انقلاب کی اصطلاح سامنے آتی ہے جو نوآبادیاں اس دوران آزادی حاصل کرتی ہیں وہ دو مختلف طرح کے راستے اختیار کرتی ہیں۔ جن نوآبادیوں میں آزادی کی جدوجہد کے دوران کمیونسٹ پیش پیش تھے اور لیڈنگ رول کردار ادا کر رہے تھے وہ آزادی کے بعد عالمی طور پر سوویت بلاک

کا حصہ بنتی ہیں اور ایک مختلف طریقے سے ترقی کی جانب اپنا سفر شروع کرتیں ہی۔ مثال کے طور پر چین، کوریا، ویت نام، کیوبا وغیرہ۔

جبکہ جہاں کمیونسٹ اور ترقی پسند اس قومی آزادی کی جدوجہد میں لیڈنگ رول نہیں لے سکے یا مذہبی بنیاد پر اس قومی آزادی کی جدوجہد کی تقسیم کے عمل کو نہ سمجھ سکے (مثال ہندوستان) وہ نوآبادیاں آزادی کے بعد سامراجی حکمت عملی کے تحت کالونیل ازم کی نئی شکل نیوکالونیل ازم میں پھنس کر رہ گئی اور ابھی تک خودمختاری کے لوازمات سے محروم ریاستوں کے طور عالمی نظام میں چل رہی ہیں۔

چنانچہ پاکستان اس سارے منظرنامے کے نتیجے میں ایک ملک/ریاست کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ برصغیر ہندستان میں تقسیم چونکہ صرف مذہبی بنیادوں پر کی گئی تھی اس لیے اس نئی نوزائیدہ ریاست میں مختلف طرح کے سوال سامنے اٹھ کر آئے اور یہاں بسنے والی قومیتوں نے مختلف حوالوں سے قومی سوال کو اُٹھایا۔

پاکستان چونکہ متحدہ ہندوستان کے اندر پسماندہ مسلم علاقوں پر مشتمل ریاستوں اور علاقوں کی صورت میں وجود آیا تھا اس لیے پاکستان بننے کے بعد چونکہ نئی ریاست اور حکمرانوں نے پرانے پسماندہ پیداواری رستوں کو تبدیل کرنے کیلئے کوئی اصلاحات وغیرہ متعارف نہیں کروائی گئی تھیں۔ (ویسے بھی یہ سب بندوبست کیوں کیا جاتا کیونکہ یہ تو اس عالمی حکمت عملی کا حصہ ہی نہیں تھا جس کے تحت پاکستان وجود میں آیا تھا) اس لیے پرانے نظام کے تحت چلنے کی وجہ سے ملک میں مختلف علاقے یا ثقافتی گروہوں نے ناہموار ترقی کی وجہ سے علیحدگی یا علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بننے کے عمل سے گزرا اور باقی ماندہ پاکستان میں اس ناہموار ترقی سے جنم لینے والا نیشنل ازم آج بھی علیحدگی یا علیحدہ ریاست کے مطالبوں سے گزر رہا ہے۔ عمومی طور

پر ناہموار ترقی کے تاثر (Perception) سے پاکستان کے مخصوص حالات میں علاقائی یا صوبائی نیشنل ازم کا جنم لینا ایک فطری عمل ہے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ ہر فطری عمل جدوجہد میں مثبت رخ لے وہ منفی رخ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اس عمومی تصور سے جنم لینے والے خیالات یا نظریات دراصل ناہموار ترقی کی مادی وجوہات کو بالکل نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں دوسرے اوپری سطح پر نظر آنے والے تعلقات کو بنیاد بنا رہے ہوتے ہیں۔

### کالونیل دور میں قومی تحریکیں اور آج کے پاکستان میں قومی تحریکیں؟

عام طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کمیونسٹ کیونکہ کالونیل دور میں جاری قومی تحریکوں میں پیش پیش تھے تو اس لیے آج کے پاکستان میں بھی جاری قومی تحریکوں کی غیر مشروط حمایت کرنا بھی کمیونسٹوں پر اسی طرح فرض ہے جیسے وہ کالونیل دور میں قومی تحریکوں کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ اس حوالے سے کالونیل دور میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کے لیڈروں کی تقریروں کے حوالے اور وضاحتیں پیش کرنے کا سلسلہ بھی آگے آگے ہوتا ہے۔ ایک خاص حالات اور وجوہات کی بناء پر جنم لینے والی سیاسی حکمت عملی کو کسی بھی طور پر بدلے ہوئے حالات اور مقامات پر اسی طرح منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

اس لیے کالونیل دور میں چلنے والی قومی آزادی کی تحریکوں کی وجوہات بیان کرنا ضروری تھیں تا کہ جب ہم آج قومی تحریکوں کیساتھ اس کا تقابلی جائزہ لیں تو بات رکھنے اور سمجھنے میں آسانی رہے۔

کالونیل دور اور آج کے نیوکالونیل پاکستان کے درمیان اہم بنیادی فرق ہیں جن کو میں بیان کرنا چاہوں گا۔ کالونیل ازم کے عہد میں کسی بھی کالونی کے اندر رہنے والی اشرافیہ اپنی حاکم قوم یا ملک کی اشرافیہ کا حصہ نہیں ہوتی تھی؟ کالونیل ازم کے عہد میں

کالونیوں پر باہر سے دوسری قوموں/ملکوں کا قبضہ تھا ان کا اس طرح سے پہلے سے کوئی بھی تاریخی تعلق کسی بھی سطح کا (ثقافتی، علاقائی، معاشی) نہیں تھا۔

کالونیل دور میں ابھرنے والی تحریکیں بیرونی قبضہ کے خلاف تھیں اور ایک متحدہ ریاست تشکیل دینے کی جدوجہد تھی نا کہ علیحدگی کی تحریکیں (ہندوستان، چین، ویت نام کی مثال)۔ کالونیل ازم کے عہد میں ابھرنے والی قومی تحریکیں اپنے پیچھے ترقی کے مختلف مدراج سے ابھرنے والے لوکل سرمایہ قومی سرمایہ کا وجود رکھتی تھیں اس لیے وہ آزادی کیلئے ادھر ادھر منہ اٹھا کر دیکھنے کی بجائے اپنی سپورٹ بیس پر انحصار کرتی تھیں جبکہ آج پاکستان میں ابھرنے والی قومی آزادی کی تحریکوں کے پیچھے نیو کالونیل ازم اور نوسامراجیت کے اس عہد میں کسی بھی ایسے قومی سرمایہ کی حمایت اور مدد حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے یہ قومی آزادی کی تحریکیں اپنی آزادی کیلئے عالمی طاقتوں کے سہارے تلاش کر رہی ہیں۔ یہ بنیادی فرق اگر ہم انہیں فرق سمجھتے ہیں تو کالونیل دور کی قومی تحریکوں اور آج پاکستان کے معروضی حالات میں سے ابھرنے والی قومی تحریکوں میں فرق واضح کرتے ہیں۔ اگر ہم ان بنیادی فرقوں کو سامنے رکھ کر آج کی قومی تحریکوں کا تجزیہ کریں گے تو ہمارا تجزیہ یقیناً مختلف نتائج اخذ کرے گا اور اگر ان متفرقات سے اجتناب کر لیا جائے تو یقیناً مختلف نتائج اخذ ہوں گے۔

اب ہم ان سوالوں کو ایک اور رخ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے بنیادی مفروضے کے دونوں پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مفروضہ ہے۔ کیا آج کا پاکستان اندرونی طور پر کالونیلائزڈ ہے یا نہیں؟ اس سوال کو ہم یوں بھی رکھ سکتے ہیں کہ کیا پاکستان میں بسنے والے قومیتی، لسانی یا ثقافتی گروہ اندرونی طور پر کسی ایک قومیتی گروہ کی وجہ سے اپنے ثقافتی، لسانی اور معاشی حقوق سے محروم ہیں یا نہیں؟ کیا

پاکستان کی ریاستی اشرافیہ کسی ایک قومیتی گروہ پر مشتمل ہے؟ کیا پاکستانی ریاست کسی ایک قومیتی گروہ پر مشتمل قومی ریاست ہے؟

## کیا پاکستان اندرونی طور پر کسی ایک قومیتی گروہ پر مشتمل ریاست ہے؟

پاکستان مختلف بڑے اور چھوٹے قومیتی، نسلی، لسانی اور ثقافتی وحدتوں پر مشتمل ایک متحدہ سیاسی ریاست ہے۔ ان تمام گروہوں، قومیتوں کا انگریز راج کے آغاز کے بعد کالونیل سرمایہ دارانہ رشتوں سے کم وبیش ایک ہی طرح کا تعلق رہا ہے۔ سرمایہ داری کی ناہموار ترقی نے صنعتی ترقی کو کچھ خاص جگہوں پر مرتکز کیا ہے۔ اسی طرح کی ترقی اور فرق ہمیں زراعت اور تعلیم کے میدان میں بھی نظر آتا ہے۔

آج پاکستان میں کوئی بھی ایک قومیتی گروہ یا حاوی حکمران طبقہ کسی ایک قومیتی گروپ پر مشتمل نہیں جو دوسری قومیتوں کا استحصال کر رہا ہو۔ پاکستان کی بڑی بورژوازی جو کہ حکمران طبقہ کا ایک بہت اہم حصہ ہے وہ مختلف قومیتی گروہوں پر مشتمل ایک متحدہ مفادات رکھنے والا طبقہ ہے۔ اگر ہم پاکستان کے بڑے اڑتالیس (۴۸) تجارتی اجارہ دار گروپوں کی ہیت کا تجزیہ کریں تو مختلف قومیتی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والا ایک طبقہ ہے جو تمام قومیتوں کے ذرائع پیداوار اور اس سے بننے والے قدر زائد کو کنٹرول کر رہا ہے۔ ان 48 بڑے اجارہ دار گروپوں میں 6 پنجابی، 16 میمن ۴ گجراتی، خواجہ اسماعیلی، 10 چنیوٹی شیخ، 4 مدارسی، پارسی، بنگالی اور 5 پشتون اجارہ دار گروپ ہیں۔ جو کہ پاکستان کی بڑی بورژوازی پر مشتمل ہیں جس کے مختلف علاقائی اور چھوٹے بورژوای گروپوں کیساتھ صنعتی تعلقات ہیں اور تمام مفادات میں ساجھے داری بھی ہے۔

ناہموار ترقی کی وجہ سے پاکستان کی بڑی بورژوازی کی اضافی لحاظ سے چھوٹی بورژوازی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور علاقائی یا چھوٹی بورژوازی کے آل پاکستان

بورژوازی سے مختلف سطح پر تنازعات اور الجھاو کی کیفیت بھی رہتی ہے۔ عالمی سطح پر بڑی بورژوازی اور چھوٹی بورژوازی عالمی سرمایہ داری نظام میں اپنا اپنا حصہ لینے کی دوڑ میں شامل ہیں اور گماشتہ کا رول ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح عمومی طور پر یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ پاکستان میں سیاسی طاقت کا سرچشمہ چونکہ فوج اور جاگیرداروں کا گٹھ جوڑ ہے نہ کہ یہ ابھرتی سرمایہ دار کلاس اس لیے لینڈ لارڈازم، آرمی اور سول افسر شاہی کی ہیئت کا بھی تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ پاکستان میں بڑی تعداد میں زمین کی ملکیت عمومی طور (باڈر ایریا کو چھوڑ کر) قومیتی سطح پر قائم باؤنڈرزی کے بیچ ہی محدود ہے۔ پاکستان میں جاگیردار کلاس/لینڈ لارڈ کلاس کسی دوسری قومیت کو Oppressed نہیں کررہی ہے۔

اسی طرح سول اور ملٹری بیوروکریسی کا بھی کوئی ایسا شواہد نہیں ملتا جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ پاکستان کی سول اور ملٹری بیوروکریسی کسی ایک قومیتی گروہ پر مشتمل ہے جبکہ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ پنجاب کے جس علاقے سے سول بیوروکریسی کا تقریباً 40 فیصد حصہ جاتا ہے وہ علاقے پنجاب میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ اس سے ملتی جلتی ہوئی صورت ہمیں ملٹری بیوروکریسی پر مشتمل علاقوں کے متعلق کی جاسکتی ہے۔ پاکستان میں آرمی بھرتی کیلئے کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں جو قومیتی بنیادوں پر مشتمل ہو (جبکہ اس سلسلے میں اب حال ہی میں بلوچستان مین سے بھرتی زیادہ کرنے کیلئے بھرتی معیار کے اندر بلوچستان کیلئے خاص معیار بنایا گیا جو کہ پہلے سے موجود میعار کو نرم کر کے بنایا گیا ہے۔ ان اٹل حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مفروضہ کہ پاکستان اندرونی طور پر کسی ایک قومیتی گروہ پر مشتمل ریاست ہے غلط ثابت ہوتا ہے۔ پاکستان کی بڑی بورژوازی اور سول ملٹری بیوروکریسی کثیر القوامیتی ہیت رکھتی ہے چنانچہ اس کے خلاف جدوجہد بھی مشترکہ ہی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ جس میں وہ تمام کثیر الاقوامیتی طبقات شامل ہوں جن کا استحصال یہ حکمران طبقہ کررہا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے

کہ اس استحصال کی شدت کسی ایک جگہ زیادہ ہو یا پھر اس استحصال کی کثافت (Denisty) کسی دوسری جگہ زیادہ ہو۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انقلابی پارٹی اپنی جدوجہد کا آغاز اپنی حکمت عملی کے طور پر کسی بھی جگہ سے کرسکتی ہے۔ عمومی طور پر جدوجہد کیلئے ایسے ہی علاقے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ یہاں استحصال کی شدت اپنی بدترشکل میں موجود ہو۔ گوریلا سیاسی حکمت عملی کے اندر اس جدوجہد کو چیئرمین ماؤ کے بقول'' Encircle the urban center from peripehri'' کہتے ہیں۔ اس حکمت عملی کی بنیاد پر آج دنیا میں مارکسٹ لیننسٹ جدوجہد کررہے ہیں۔ مثال کے طور پر انڈیا میں نکسل باڑی گوریلے انڈین ریاست کے پسماندہ ترین قبائل (ادااد یسویوں) میں ان قبائل کے معاشی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کی جنگ لڑرہے ہیں اور اپنی مضبوط بنیادیں ان جنگلوں میں آباد لاکھوں پر مشتمل آبادی کے اندر رکھتے ہیں لیکن جو بات انہیں قوم پرستوں سے مختلف کرتی ہے وہ ہے ان کی جدوجہد کی حکمت عملی وہ اپنی حکمت عملی میں چھتیس گڑھ کے پسماندہ قبائل کی معاشی جدوجہد کو بنیاد پر کسی بھی طرح کا ادیواسی نیشنلزم نہیں ابھار رہے اور انڈین ریاست سے اپنے چھتیس گھڑھ کے جنگلات پر مشتمل علیحدہ ریاست کا مطالبہ نہیں کررہے ہیں بلکہ وہ چھتیس گڑھ کے پسماندہ قبائل کی جدوجہد کو دہلی، کلکتہ کے محنت کشوں اور کچی آبادیوں میں بسنے والے محنت کشوں کے ساتھ جوڑ رہے ہیں اور ایک نئی بھارتی ریاست کی تشکیل کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔

اس لیے محنت کش طبقہ اور اس ملک کے مزارع ہاری اور کھیت مزدور ہی وہ طبقات ہیں جو حکمران طبقہ کا استحصال کا شکار ہورہے ہیں۔ اس لیے مختلف صوبوں کی چھوٹی بورژوازی کی طرف سے ابھارے گئے (اپنے مفادات کی خاطر) قومی سوال پر محنت کش طبقے کی مشترکہ تحریک کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

## نیپ کی تشکیل اور کمیونسٹوں کا رول

پاکستان بننے کے فوری بعد پاکستان کی نوزائیدہ ریاست چونکہ عالمی سطح پر امریکی سامراجی بلاک کا حصہ بن گئی اس لیے ایسی صورتحال میں ملک کے اندر ترقی پسندوں اور کمیونسٹ خیالات رکھنے والے سیاسی کارکنوں پر ریاست کا رویہ سخت ہونے لگا۔ کمیونسٹوں کی طرف سے اس گٹھ جوڑ کی مخالفت اور سرد جنگ میں فرنٹ لائن ریاست ہونے کی وجہ سے حکومت وقت نے امریکی سامراج کو خوش کرنے کیلئے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی لگادی اور کمیونسٹ کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ اس سیاسی صورتحال میں کمیونسٹ اور ترقی پسند سیاسی کارکن کبھی میاں افتخار الدین کی آزاد پاکستان پارٹی تو کبھی سہروری کی عوامی لیگ کو فیس شیلڈ کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں حکمران طبقے نے پاکستان کے کثیر الثقافتی، کثیر السانی تشخص کو تسلیم کرنے کی بجائے مذہب اور قومی زبان اردو کے نام پر مسخ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جس کے نتیجے میں مختلف علاقائی شناختوں کی بنیاد علاقائی قوم پرستی کے رجحان ابھر کر سامنے آئے۔ کمیونسٹوں نے چونکہ پہلے مذہب کی بنیاد پر پاکستان کی حمایت کی تھی اس لیے اپنی اس غلطی کے ازالہ کے طور پر اور عالمی سیاست میں پاکستانی ریاست کے سامراجی کیمپ میں کھڑے ہونے کی وجہ سے ریاست کی تحلیل کو اپنا سب سے پہلا انقلابی فرض بنالیا!

اس لیے کمیونسٹوں کے اندر اس ریاست کی (Negation) نفی کے جذبات اپنی انتہاء کو پہنچ گئے۔ ایسے میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بننے کے عمل سے دوچار ہوا۔ (یہ مضمون علیحدہ بحث طلب ہے کہ اس کے پیچھے کونسے اندرونی اور بیرونی حالات کارفرما تھے جس کی وجہ سے وہ مشرقی پاکستان علیحدگی کے عمل سے دوچار ہوا۔)

نیپ کی سیاست میں کمیونسٹ کوئی فیصلہ کن رول ادا کرنے سے قاصر تھے کیونکہ

کمیونسٹ ہمیشہ ہی نیپ کے اندر کنفیوژن کا شکار رہے اوراس کے ساتھ ساتھ اپنی علیحدہ کوئی سیاسی وژن نہیں رکھتے تھے جس کی بنیاد پر نیپ کی سیاست میں اثر انداز ہو سکتے۔ نیپ کی قیادت عمومی طور پر مختلف قومیتوں کی چھوٹی بورژوازی پر مشتمل تھی جس کے پاکستان کے اندر ابھرنے والی بڑی بورژوازی سے تضادات رکھتے تھے۔ عالمی سطح پر اس وقت سوویت یونین کی شکل میں ایک بڑا سوشلسٹ بلاک موجود تھا جس کی وجہ سے مختلف قومیتوں کی چھوٹی بورژوازی کی قومی آزادی کی تحریکیں چلانے کے دعوے کرتی تھی اور آزادی کیلئے عالمی سطح پر سوویت یونین کی طرف امید سے دیکھتی تھی اور اس مقصد کیلئے کمیونسٹوں کے تھوڑے بہت نخرے بھی برداشت کرنا نیپ کی قیادت کی مجبوری تھی۔ جبکہ نیپ کے اندر طبقاتی سوال پر سیاست کرنے والوں کو شک کی نظر سے دیکھا جانا اوران کیلئے کسان کمیٹی کا کام کرنا پنجاب کے علاوہ عملاً ممنوع تھا۔ اس طرح کے پیٹی بورژوا کردار کی وجہ سے نیپ تقسیم کے عمل سے دوچار ہوئی۔ لیکن سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد بھی نیپ میں موجود کمیونسٹ (ایک دھڑا) قومی جمہوری انقلاب کے نعرہ کے تحت طبقاتی سوال کو قومی سوال کے نام پر نظر انداز کرنے کا رویہ سوویت یونین کے ٹوٹ جانے تک غالب رہا۔

## قومی حقوق کے نام پر علیحدگی پسندی کی جدوجہد

کسی بھی قومیتی، نسلی یا لسانی گروہ خواہ وہ کتنا بھی چھوٹا یا بڑا ہو تمام قومیتوں کو اپنے معاشی ثقافتی حقوق کیلئے جدوجہد کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ تمام حقوق ہر قومیتی گروہ کو ملنے چاہیے۔ ہر کسی کو اپنے کلچر اور مثبت روایات کو فروغ دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی انسان دوست اس حق سے انکار کرسکتا ہے۔ محنت کش عوام ان قومیتی حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح کی ثقافتی رنگا رنگی سے محظوظ ہوتے ہیں جبکہ حکمران طبقات اپنے مفادات کے تحت اس رنگا رنگی کو تسلیم کرنے سے عاری ہیں

چنانچہ قومی حقوق کے نام پر علیحدگی پسندی کی جدوجہد سمجھ سے بالاتر ہے۔

ہاں اگر سامراجی حکمت عملی کو آج کے اس نیو کالونیل عہد میں دیکھیں تو ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بڑی ریاستیں کالونیل ازم کے خاتمہ کے بعد کسی حد تک خود مختاری کے مادی لوازمات رکھتی تھیں اور اس لیے اس خطے میں سامراجی حکمت عملی یہی رہی ہے کہ کسی طرح اس خطے کو نیو کالونیل ازم کے عہد میں کنٹرول کرنے کیلئے آپس میں لڑایا جائے اور ان متفرقات کو ابھارا جائے جو اس خطے کے لوگوں کی آپسی جڑت کو کمزور کرے۔ مذہب کے نام پر یا پسماندہ مسلم ریاستوں پر مشتمل ریاست پاکستان کی تشکیل اور پھر قومی حقوق کے نام پر بنگلہ دیش کی تخلیق اور یہ سلسلہ ابھی تک رکا نہیں۔۔۔ چھوٹی ریاستیں یا چھوٹی منڈیاں عالمی سرمائے کیلئے زیادہ آسانی کے ساتھ Manageable ہوتی ہیں، بہ نسبت اس کے ایک بڑی منڈی۔۔۔

اس تناظر میں 1980ء کی دہائی کے بعد شناخت کی سیاست کے نام پر محنت کش طبقہ (workingclass) کی شناخت کو کمزور کیا گیا تا کہ مختلف شناختوں پر تعمیر ہونے والی یونٹی عالمی سرمائے کے لیے کوئی خطرہ نہ بنے اور عالمی سامراجی سرمائے کی اس منڈی کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں 1980ء کے بعد NGO's نے بھی سامراج کے اس مقصد کو مدد فراہم کی۔ مختلف شناختوں کو ابھار کر ورکنگ کلاس متبادل کو کنفیوژ کرنا سامراجی حکمت عملی ہے۔ اس مقصد میں کافی حد تک وہ کامیاب ہیں کیونکہ بائیں بازو کے علمبردار بھی اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں کیونکہ یہ سیاست اپنے اندر پاپولزم کا عنصر بھی رکھتی ہے اور کافی حد تک بائیں بازو بھی اس پاپولزم کا شکار ہوا ہے۔

## کیا چھوٹی ریاستیں خود مختاری کے لوازمات رکھتی ہیں؟

مندرجہ بالا حصہ میں ہم نے چھوٹی ریاستوں اور منڈیوں کی تشکیل دینے کی

سامراجی حکمت عملی پر بحث کی۔ فرض کریں اگر ہم یہ سمجھیں کہ پاکستان کی ریاست بہت زیادہ عوام دشمن ہے اس لیے اس کو توڑ کر قومی یا لسانی بنیادوں پر چھوٹی ریاستیں تشکیل دے دی جائیں تو پھر اس کے متوقع نتائج پر ہم بحث کرتے ہیں۔ ایک فریم ورک سرد جنگ کے دوران کا ہے اور دوسرا فریم ورک سرد جنگ کے بعد سے ابھرنے والے عالمی منظر نامے کا ہے۔ دونوں کے نتائج اپنی نوعیت میں مختلف ہیں۔ اگر اس پاکستان کو سرد جنگ کے دوران اس طرح قومی بنیادوں پر تقسیم (Distintegrate) کر دیا جائے جیسا کہ ہمارے قوم پرست صاحبان چاہتے ہیں تو یہ امید ممکن تھی کہ قومی ریاستیں علیحدگی یا آزادی کے بعد عالمی سیاست میں سوویت بلاک کا حصہ بنتی اور اس متحدہ ریاست کے عالمی سامراجی کیمپ میں موجود Front line state کے رول کو دھچکا پہنچتا اور سامراجی منڈی کو اس خطے میں نقصان پہنچتا لیکن بنگلہ دیش بننے کے بعد بنگلہ دیش کے عالمی سیاسی کردار کے بعد اس امید اور نتائج پر بھی گہرے سوالات ہیں کہ واقعی باقی ماندہ پاکستان کی جغرافیائی انتشار پذیری کے بعد نئی تشکیل ہونے والی قومی ریاستیں سامراج مخالف کیمپ کا حصہ بنتی؟؟؟

یہ تو تھے سرد جنگ کے فریم ورک میں ابھرنے والے نتائج۔ اب ذرا سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اس نیو ورلڈ آرڈر کے سامراجی عہد میں پاکستان کی جغرافیائی انتشار پذیری کے بعد بننے والی نئی حد بندیوں اور اُس کے نتائج پر بات کر لیں۔ میرے خیال میں تو کوئی بھی ایسی قومی تحریک اپنے اندر آج سامراج مخالفت کا عنصر نہیں رکھتی اور عالمی سوشلسٹ بلاک کے انہدام کے بعد ویسے بھی متبادل راستہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتا۔ چنانچہ پھر ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے اور ہماری جدوجہد کی سمت اس سامراجی تضاد اور یک قطبی (Uni Polar) اس دنیا میں کیا ہونی چاہیے؟

## کیا علیحدگی کی جدوجہد ورکنگ کلاس متبادل کیلئے فائدہ مند ہے؟

اب ہم ایک اور نقطہ نظر سے پاکستان کی جغرافیائی انتشار پذیری کے نتائج کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے کمیونسٹ حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ ریاست ٹوٹتی ہے تو ہمیں (مزدور طبقہ) کو کیا فرق پڑتا ہے اور کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ریاست کا کسی بھی شکل میں ٹوٹنا محنت کش طبقہ کیلئے سودمند ہے۔ کچھ اس بات کو یوں بھی رکھتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست اور قومی ریاستوں کی تشکیل پاکستان میں قومی سوال کو حل کر دیں گے اور اس کے بعد طبقاتی سوال اپنی صحیح شکل میں ابھر کر سامنے آئے گا۔ آج طبقاتی سوال قومی سوال کے نیچے دبا ہوا ہے۔ طبقاتی سوال اس وقت تک ابھر کر سامنے آ ہی نہیں سکتا جب تک اس ریاست کو توڑا نہیں جاتا۔ عام طور پر ریاست کو توڑنے کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک ریاستی اداروں کو توڑ کر نئے ریاستی ادارے تشکیل دینا جبکہ دوسرا مفہوم ریاستی جغرافیہ کو توڑ کر نئے جغرافیائی بنیادوں پر مشتمل قومی ریاستوں کی تشکیل۔ ریاست کے توڑنے کے پہلے مفہوم کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ اگر آپ کوئی بنیادی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پرانے ریاستی اداروں کو توڑ کر نئے ریاستی اداروں کی تشکیل کی جائے۔ لیکن ہمارے کمیونسٹ حضرات کے ہاں ریاست کو توڑنے کا مطلب عام طور پر جغرافیائی بنیادوں پر توڑنے سے ہی ہے۔ ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا ریاست کو جغرافیائی سطح پر توڑنا محنت کش عوام کیلئے سودمند ہے یا نہیں؟

پاکستان ایک جغرافیائی ریاست ہے جس کے قدرتی جغرافیہ کو 1947ء میں مذہب کے نام پر ریاستی تشکیل کے عمل نے شدید دھچکا لگایا بہت سارے جغرافیائی مسائل کو جنم دیا جس کے نتائج کسی حد تک ہم بھگت رہے ہیں۔ اب سوال ہے کہ باقی ماندہ اس جغرافیائی وحدت کو توڑنا مزید جغرافیائی مسائل کو پیدا نہیں کرے گا؟ خیر اس زاویہ

(Angle) کو ابھی بحث کا حصہ نہیں بناتے بلکہ دوبارہ ہم اپنے بنیادی مفروضہ کی طرف آتے ہیں کہ کیا پاکستان کی جغرافیائی ریاست کوتوڑ نا محنت کشوں کیلئے سودمند ہے؟

آج سرمایہ ریاستی حدیں عبور کر کے گلوبل شکل اختیار کر گیا ہے لیکن سرمایہ نے اپنی لوٹ اور استحصال کو بھر پور انداز میں جاری رکھنے کیلئے محنت کو ریاستی حد بندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہم کمیونسٹوں کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ اگر سرمایہ گلوبل ہے تو پھر محنت کو بھی گلوبل ہونا چاہیے تا کہ وہ آزادی کے ساتھ سرمایہ کی اس لوٹ مار سے لڑ سکے۔ جبکہ ہمارے ملک کے کمیونسٹ پاکستان کی ریاست کو توڑ کر مزید چھوٹی ریاستوں کو تشکیل دے کر محنت کش طبقہ کو مزید قید کرنا چاہتے ہیں۔ آج ڈی جی خان کا محنت کش اپنی محنت بیچنے کیلئے فیصل آباد، لاہور، کراچی، پشاور اور اس موجودہ ریاستی حد بندی میں کہیں بھی جانے کیلئے قانونی طور پر آزاد ہے۔ اس طرح ملک کے کسی صنعتی حصے سے محنت آزاد ہے کہ وہ کسی بھی جگہ جا کر اپنی محنت بیچنے کیلئے بہتر طریقے سے Bargaining کرے جبکہ ہمارے کمیونسٹ اس محنت کش سے اس کی یہ انتہائی محدود آزادی بھی چھین لینے کے درپے ہیں۔ پاکستان کی جغرافیائی ریاست کو توڑ کر نئی قومی جغرافیائی وحدتوں کی تشکیل دراصل پاکستانی ریاست کے پنجرے میں قید محنت کو مزید چھوٹے پنجروں میں قید کرنے کی کوشش ہے جس کو کسی بھی حوالہ سے ترقی پسندانہ اقدام نہیں کہا جا سکتا۔ یہ محنت کے نقطہ نظر سے ایک رجعت پسندانہ اقدام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ہم کسی کبوتر کو آزادی کے نام پر 796096 مربع کلومیٹر پر مشتمل پنجرے سے نکال کر اس حدود اربعہ سے کہیں چھوٹے پنجروں میں قید کر دیں۔ یہ کونسی آزادی ہے؟ اور کیسی آزادی ہے؟

## کیا کمیونسٹ Antistate ہوتے ہیں؟

ہمارے ہاں (کمیونسٹوں) میں Antistate ہونے کا رویہ بہت زیادہ رائج

ہے۔ہم ریاست کوتوڑنے کے دوعلیحدہ علیحدہ حصوں پر بات تواوپر کر چکے ہیں اور کمیونسٹوں کا Antistate ہونے کا اصل مفہوم بھی بیان کر چکے ہیں۔ پاکستان میں عمومی رویہ (ریاست کو توڑنے کے حوالے) کمیونسٹوں میں اس حد تک رائج ہے کہ کبھی کبھی انارکسسٹوں اور کمیونسٹوں کے درمیان فرق نہ ہونے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ پاکستان میں آج بھی اپنے آپ کو کمیونسٹ کہلوانے والے قومی تحریکوں کی طرف ہمدردانہ نقط نظر صرف اس لیے رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ ریاست کے کیساتھ لڑنے کی خواہش کی تکمیل انہیں قوم پرستوں کی شکل میں نظر آتی ہے توچنانچہ اپنی خواہش کے اس پس منظر میں کمیونسٹ قوم پرستوں کی تحریک کے دوسرے نتائج سے لاپرواہی برتتے ہیں جو کہ ایک خطرناک رویہ ہے۔اگر دوسری طرف قوم پرست تحریکوں کے ساتھ جڑے ہوئے طبقات کا بھی تجزیہ کیا جائے تو اس میں بھی ہمیں وہ طبقات نظر آتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے ریاست سے نہ خوش نظر آتے ہیں۔لیکن متبادل قوت نہ ہونے کی وجہ سے اپنی ریاستی سے لاتعلقی کا اظہار مذہبی اور قوم پرست تحریکوں کے ساتھ شامل ہوکر کرتے ہیں۔ جہاں بات جو سمجھنے والی ہے وہ یہ ہے کہ نوجوان جو کہ لوئر مڈل کلاسز سے ان تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں وہ اس سماجی نظام اور ریاستی دھونس دھاندلی سے نالاں ہیں نہ کہ قوم پرستانہ نظریات کی طرف راغب۔اس لیے اپنی جگہ سماج میں بنانے کیلئے ضروری ہے کہ کمیونسٹ درست نقطہ نظر کیساتھ سماج کی ان پرتوں میں جدوجہد کرتے ہوئے نظر آئیں۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان تحریکوں اور پرچاروں کی غیر مشروط حمایت کریں۔ کیونکہ ہمارے بہت سے نظریاتی دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اس طرح قوم پرست تحریکوں کی حمایت کھل کر کریں گے تو ان تحریکوں کیساتھ جڑا ہوا لوئر مڈل کلاس اور درمیانے کسانوں کا طبقہ ہماری طرف متوجہ ہو جائے گا۔جس سے ہمیں ان جگہوں پر پارٹی بنانے میں مدد ملے گی۔ جب کہ ہم

سمجھتے ہیں کہ یہ نقطہ نظر موقع پرستانہ نقطہ نظر ہے۔ قوم پرستی یا نیشنل ازم کی حمایت کرنے سے ہم قطعی طور پر مضبوط نہیں ہوں گے بلکہ اس سے وہی لوگ مضبوط ہوں گے جن کا یہ نظریہ ہے۔ اسی طرح کا رویہ بعض دفعہ کچھ حلقوں کے اندر مذہبی شدت پسند تحریکوں کے حوالے سے بھی ہوتا ہے۔ یہ دو مختلف طرح کی موقع پرستیاں ہیں جس کے خلاف ہمیں ورکنگ کلاس متبادل تشکیل دینے کی جدوجہد کرنی ہے۔

## کیا چھوٹی ریاستیں خودمختاری کے لوازمات رکھتی ہیں؟

فرض کریں پاکستان کو چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے تو کیا یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنے اندر خودمختاری کے لوازمات رکھتی ہیں یا نہیں؟ اور کیا یہ تمام ریاستیں سماجی ترقی کے تمام تر لوازمات اپنے تئیں رکھتی ہیں یا نہیں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کو توڑ کر قومی ریاستوں کی تشکیل کا منصوبہ سرد جنگ کے پیریڈ میں تو اپنے اندر شاید کچھ کشش اور مواقع رکھتا ہو کیونکہ عالمی سطح پر ان ریاستوں کو سرد جنگ میں عالمی سامراجی کیمپ میں اپنے ساتھ کھڑا کر کے سامراج کے خلاف اس خطے میں جدوجہد میں کوئی پیش رفت ممکن ہو سکتی تھی لیکن کیا آج کی پوسٹ کولڈ وار دنیا میں اس جدوجہد کے کوئی امکانات وجود رکھتے ہیں؟ اور آج کے عالمی یونی پولر ورلڈ کے اس منظر نامے میں یہ قومی ریاستیں پہلی بات ہے کہ کسی بیرونی امداد سے پاکستانی ریاست سے آزادی حاصل کریں گی اور دوسری بات کہ کن متبادل راستوں سے ترقی کی جانب سفر طے کریں گے جو کہ عالمی سامراجی مفادات کے سامنے رکاوٹ بن سکے۔ اگر ہم آج کی قومی تحریکوں کے پس منظر اور ان کے سیاسی رویے کی طرف نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ قومی ریاستوں کی تشکیل کا یہ منصوبہ کس کی ایماء پر تشکیل کے مرحلے میں سے گزرے گا اور اس کے اس خطے میں ورکنگ کلاس متبادل کی تشکیل کو کس قدر ٹھیس پہنچائے گا۔ اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ قومی

ریاستیں اپنے تئیں ترقی کے لوازمات پورے کرنے سے قاصر ہیں۔اس لیے اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ یہ قومی ریاستیں آپس میں اپنے مشترکہ وسائل رزق پر لڑ پڑیں گیں۔(جس میں پانی پر لڑائی اور دوسرے قدرتی وسائل پر لڑائی) اپنے عروج پر ہوگی اور اپنی خودمختاری کے تحفظ کیلئے خطے سے باہر طاقتوں کے ہاتھ اپنی خودمختاری بیچ کر عالمی طاقتوں کی طفیلی ریاستوں کا کردار ادا کریں گے۔(مثال کے طور پر سابق USSR سے آزاد ہونیوالی ریاستوں کا عالمی سیاسی منظر نامے میں رول واضع ہے۔)

اس لیے ہم سمجھتے ہیں پاکستان ایک جغرافیائی سیاسی وحدت پر مشتمل ریاست ہے جو کہ اپنے قدرتی وسائل رزق مشترکہ اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے رکھتی ہے۔ چنانچہ اس جغرافیائی وحدت کی انتشار پذیری کسی بھی شکل میں خطے میں قدرتی وسائل رزق کی تقسیم کیلئے لامتناہی جھگڑے اور تنازعے پیدا کرے گی۔

## کیا کیا جائے؟

پاکستان میں ہمیں دو علیحدہ علیحدہ انتہاوں پر موجود تصورات آپس میں لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایک طرف مائنڈ سیٹ مذہب کی بنیاد پر قومی تشکیل کی کوششوں میں مصروف نظر آتا ہے تو دوسری جانب نسلی اور لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر قومی ریاستیں بنانے کی جدوجہد تشکیل پاتی ہوئی نظر آتی ہے۔اول الذکر قوم پرستی اپنے پیچھے آل پاکستان کی بڑی بورژوازی (ریاستی پرورش میں پیدا ہونے والی بورژوازی) کی حمایت نظر آتی ہے تو دوسرے مخالف لسانی اور قومیتی نقطہ نظر کے پیچھے ان قومیتی اور ثقافتی گروہوں کی چھوٹی بورژوازی کی حمایت و تائید نظر آتی ہے۔جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ ان دونوں بورژوازیوں میں تضادات اور تناؤ شروع سے ہی چلا آرہا ہے۔ جب یہ تضاد ذرا شدت اختیار کرتا ہے تو اس طرح کی تحریکیں ذرا زور و شور سے شروع ہوتی ہیں اور جب اس چھوٹی

بورژوازی کی مراعات کوتسلیم کرلیا جاتا ہےتو قومی تحریکوں کی آواز دب جاتی ہے۔ پچھلے 65 سال کے عرصہ میں اس کشمکش کے نتیجے میں ایک محدود مکتبہ فکر ایسے لوگوں پر مشتمل بھی پیدا ہو گیا ہے جن کے نزدیک نیشنل ازم بحیثیت نظریہ پروان چڑھی ہے۔ پاکستان میں کمیونسٹوں کے اندر شروع دن سے ریاست دشمنی (جغرافیائی بنیادوں) اپنے عروج پر ہے۔اس لیے ہر ریاست دشمن تحریک کو دانستہ اور غیر دانستہ حمایت کو اپنا پہلا انقلابی فرض سمجھا گیا ہے۔اس بنیاد پر ہی اپنی تنظیم کے نام میں ریاست کے نام سے بے زاری کا اظہار اور تنظیم کو ریاستی بنیادوں پر تشکیل دینے کی بجائے علاقائی اور قومیتی اور ثقافتی بنیادوں پر تنظیم کی تشکیلات پر زور دیا گیا اور آج تک یہی کنفیوژن کسی نہ کسی شکل میں برقرار ہے۔کوئی بھی آرٹسٹ جب بھی کبھی کوئی مصوری پر مشتمل فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے خاکے اور مصوری کی تصویر کو ڈرائنگ پیپر پر اتارنے سے پہلے اُس کی باؤنڈری لائن لگاتا۔آرٹسٹ کے ذہن میں تخلیق ہونے والا خاکہ اس وقت تک کاغذ پر نہیں اتر سکتا جب تک اسے یہ ہی معلوم نہ ہو کہ وہ کتنا کاغذ کا حصہ استعمال کرے گا۔اس لیے ہمارے مارکسسٹوں اور لیننسٹوں کو انقلاب کی تصویر کشی کیلئے سب سے پہلے اپنی باؤنڈری کو متعین کرنا بہت ضروری ہے۔جغرافیائی حد بندی طے کیے بغیر انقلاب کی تصویر کشی پایہ تکمیل تک پہنچ سکتی ہے۔

چنانچہ پہلی سطح پر اپنے Antistatism (جغرافیائی بنیادوں پر) کے رویہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں قومی سوال کو Tactical way میں ڈیل کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کیلئے نیشنلزم بحیثیت نظریہ رد کر کے سرمایہ داری کے ناہموار ترقی کے ماڈل کی مختلف جہت حرکیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں زیردست قومیتی اور ثقافتی گروہوں کے علمبردار اپنے جواز کی دلیل میں اسی ناھمواریت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔اس

لیے وہ اس طرح کی Irrational حد بندیاں کرتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر لاہور، کراچی اور دوسرے بڑے شہروں کے بڑے بڑے پلازے اور روڈز ہی ترقی کیلئے پیمانہ ہیں۔ ان کو ان بڑے شہروں کی کچی آبادیوں میں رہنے والوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حالانکہ ناہموار ترقی جو کہ سرمایہ داری نظام کا خاصہ ہے کہ خلاف جدوجہد کیلئے پشین، تربت اور دوسرے پسماندہ علاقوں میں زندگی گزارنے والوں کا اتحاد پنجاب کے پسماندہ شہروں کے باسیوں کیساتھ اور ترقی کے مینار ان بڑے شہروں میں رہنے والے محنت کشوں، کچی آبادیوں کے مکینوں کیساتھ بنتا ہے۔ ان محنت کشوں کی مشترکہ جدوجہد ہی سرمایہ داری کے خلاف اور سامراجیت سے نجات کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کیساتھ ساتھ ان پسماندہ علاقوں (جہاں سے یہ علاقائی، لسانی، ثقافتی اور قومیتی نیشنلزم ابھر کر سامنے آتا ہے) میں موجودہ فرسودہ جاگیرداری، لینڈ لارڈازم اور قبائلی باقیات کے خلاف جدوجہد ان پسماندہ سماجوں کو حقیقی زندگی کے لوازمات سے آشنا کرواسکتی ہے۔ (انڈین ماوسٹ نیپالی ماواسٹ کی جدوجہد، چین میں چیئرمین ماؤ کی قیادت میں CPC کی جدوجہد مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا تھا کہ ہمیں دو مختلف طرح کی انتھاوں کی باؤنڈری کو توڑ کر تیسرا متبادل پیش کرنا ہے۔ جس میں ایک طرف ہمیں مذہب اور دوقومی نظریہ کی بنیاد پر مشتمل قوم پرستی کو مسترد کرنا ہے اور پاکستان کو ایک کثیر القوامیتی، کثیر الثقافتی، کثیر السلانی اور کثیر انسلی گروہوں پر مشتمل ریاست کے طور پر تعمیر کرنے کی بات کرنی ہے تاکہ جہاں مختلف گروہوں کو اپنے زبان و ثقافت کی نشوونما کیلئے آزادی ہو، جبکہ دوسری طرف ہمیں قومی تحریکوں کے نام پر Separtism کی جدوجہد کو مسترد کرتے ہوئے پاکستان کی سیاسی اور جغرافیائی وحدت کو تسلیم کرنے پر زور دینا ہے تاکہ پاکستان (دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں پر مشتمل وحدت) کے مشترکہ قدرتی وسائل رزق کی بنیاد

پر اس ریاست کو صحیح معنوں میں سامراج کے نیو کالونیل تسلط سے آزاد کروایا جا سکے۔ جس کو چینیوں نے تثلیث کا نام دیا تھا یعنی کہ ریاستیں خود مختاری چاہتی ہیں، قومیں آزادی چاہتی ہیں اور عوام (مزدور کسان) انقلاب چاہتے ہیں۔ اس مثلث کی تکمیل کسی خاص ترتیب (یعنی پہلی، دوسری، تیسری سطح) کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس مثلث کی تکمیل ایک ہی وقت میں مشترکہ جدوجہد کے ذریعے آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔

# طبقاتی مسئلہ

آج کی دنیا کی سب سے بڑی سیاسی حقیقت سرمایہ ومحنت کا تضاد ہے۔ دنیا دو بڑے سیاسی دھاروں میں بٹ چکی ہے۔ دونوں طبقے ماضی کی باقیات سے اپنے اتحادی بھی رکھتے ہیں۔ یہ اتحادی بھی اپنے دھارے کے اہم اجزائے ترکیبی یا نامیاتی اعضاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سرمایہ دار طبقہ ماضی کے حکمران طبقات کی باقیات جو کہ اب بالائی اور درمیانی پرتوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ سرمایا دار طبقہ ان پرتوں پر مشتمل جاگیردار، قبائلی سردار، مذہبی پیشوائیت ورہبانیت اور قرون وسطیٰ کا تجارتی اور فوجی اشرافیہ جو کہ جدید سرمایہ دار بننے میں نااہل ہونے کی وجہ سے مافیاز کی شکل اختیار کر چکا ہے، اپنے اتحادیوں میں شامل کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار طبقہ کی داخلی گروہی تقسیم بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ ایک طرف سرمایوں کو قومی، کثیر القومی اور ماوراءقومی سرمایوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دوسری جانب اسے صنعتی، تجارتی اور مالیاتی سرمایوں کے روپ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تیسرا شعبہ

جاتی تقسیم کے لحاظ سے بھی یہ غور طلب ہیں۔ ان سب سے داخلی گروہی تضادات جن کو ہم Sub-class contradiations قرار دیتے ہیں، بہت شدید ہیں۔ ان تضادات پر لڑتے ہوئے یہ انسانی خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں لیکن محنت کش طبقہ سے طبقاتی تضاد کی لڑائی میں آپس میں متحد ہیں اور اُسے اپنے گروہی تضادات کی لڑائیوں میں گھسیٹ کر تقسیم کر دیتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے وہ ماوراء طبقاتی (Trans-class) تضادات کا سہارا لیتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ کی ریاستی اقتدار پر گرفت مضبوط کرنے والی جمہوریت، بنیادی انسانی حقوق اور شہری و شخصی آزادیوں پر مشتمل اعلان ناموں کے ذریعے انہیں مقدس بنایا گیا ہے۔ میگنا کارٹا کا اعلان نامہ انقلاب فرانس اور امریکہ کی برطانیہ سے علیحدگی کے مواقع پر جاری کیے گئے انسانی حقوق کے اعلان نامے اور اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اس سلسلہ کی اہم دستاویزات ہیں۔

یہ دستاویزات دراصل سرمایہ داری نظام کے حامیوں کی جاگیرداری نظام کے خلاف جدوجہد کی دستاویزات ہیں۔ یہ اُس بائیں بازو کے منشور ہیں جو جاگیرداری نظام کے خلاف سرمایہ داری نظام کے لیے لڑ رہے تھے۔

ان اعلان ناموں میں جمہوری اور انسانی حقوق اور شہری و شخصی آزادیوں، انسانی برابری کی صحافت اور صنف وعمر، مذہب وملت، رنگ ونسل اور زبان وثقافت کی بنیاد پر ہر قسم کے امتیازی سلوک کی مخالفت کر کے جاگیرداری کے خلاف عوامی حمایت حاصل کی گئی اور سرمایہ داری نظام کامیابی سے سرفراز ہوا۔ لیکن اصل ایجنڈا وسائل و آلات پیداوار کی سرمایہ دارانہ ملکیت کا حق اور تجارت یعنی خرید وفروخت کی آزادی، جسے مارکس نے مکر وریاکاری کی آزادی قرار دیا ہے، کو فروغ دینا اور مستحکم کرنا تھا جو کیا گیا اور باقی تمام اعلانات محنت کش

اکثریت کے لیے بے معنی ثابت ہوئے۔

سرمایہ دار طبقہ نے بطور حکمران طبقہ ریاستی سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ پانچ فیصد (جنوبی یورپ) میں جمہوریت نافذ کی جو کہ طبقاتی جمہوریت تھی اور ہے۔ طبقاتی سماج میں لاطبقاتی جمہوریت کا تصور بے معنی بات ہوتی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے نئی دریافت کردہ دنیا میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں اور وہاں کے بے پناہ وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی طاقت میں اضافہ کیا اور قدیم دنیا کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ غلام داری نظام کی باقیات اور شکست خوردہ جاگیرداری نظام کی اپنے مفادات کے تابع تشکیل نو کی۔

جب مارکس اور اینگلز اپنا کمیونسٹ مینی فیسٹو لکھ رہے تھے اس وقت دنیا کے سیاسی وسماجی نقشہ پر ذرا غور فرمایئے۔ مغربی یورپ میں فرانسیسی استثناء کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے پہلو بہ پہلو وظیفہ خوار جاگیرداری بھی موجود تھی۔ امریکہ میں ارسطو کی زمانہ قبل مسیح کی آقاؤں کی جمہوریت نافذ تھی۔ افریقہ سے غلاموں کی تجارت زوروں پر تھی۔ جاگیردار اور سرمایہ دار آقا تھے۔ ان کے درمیان فیصلہ کن لڑائی ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۵ء میں لڑی گئی۔ کینیڈا، لاطینی امریکہ اور آسٹریلیا یورپی نو آبادیوں میں شامل تھے۔ خلافت عثمانیہ کے یورپی اور افریقی حصے تیزی سے یورپی طاقتوں کے زیر اثر آ رہے تھے۔ عرب الہند، مشرق بعید، ہند چینی، فنگ چینی ایمپائر اور ہندو مغل ایمپائر یورپی کمپنیوں اور حکومتوں کی مقبوضات میں بدل چکے تھے۔ سرمایہ دار طبقہ نے اس پورے خطے میں جاگیردارانہ موروثی ریاستوں کا جال بچھا دیا تھا جو کہ ان کی طفیلی تھیں۔ خلافت عثمانیہ اور زار روس کی ریاستیں جاگیردارانہ نظام کی خودمختار شہنشاہیتوں کے طور پر موجود تھیں۔ ان طفیلی اور خودمختار جاگیردارانہ ریاستوں میں شاہوں اور امراء کے محلات اور حرم سرائیں غلاموں، لونڈیوں اور خواجہ سراؤں

سے بھری پڑی تھیں اور ان کی تجارت بھی زور شور سے جاری تھی۔لیکن مارکس ان خودمختار شہنشاہتوں کو سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں مٹتا دیکھتے ہیں جبکہ خلافت عثمانیہ سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں ختم ہوئی اور زار روس محنت کش طبقہ کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔

مارکس کے سامنے نوے فیصد سے زیادہ دنیا غلام داری اور جاگیرداری کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے اور دس فیصد سے کم دنیا بظاہر سرمایہ دار طبقہ کی حکمرانی میں ہے۔ مارکس غلام داری اور جاگیرداری کے خلاف انقلابی جدوجہد کی بات نہیں کرتا۔ وہ سرمایہ دار طبقہ کے سرمایہ داری نظام کے خلاف پرولتاریہ کے انقلاب کی بات کرتا ہے۔ مارکس عالمی انقلاب کا داعی ہے اور متذکرہ بالا صورتحال اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ مارکس سرمایہ داری سے نوگنا قد آور لیکن طفیلی غلام داری اور جاگیرداری کو سرمایہ داری نظام کے پالتو کتوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ محنت کا بنیادی اور اصلی تضاد سرمایہ سے ہے اور اسی کے محنت کش طبقہ کے حق میں حل سے اس طبقہ کی نجات مضمر ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان طفیلی طاقتوں کی پشت پر موجود اصلی طاقت کو تباہ کیے بغیر ان سے گلوخلاصی ممکن نہیں ہے۔اُس نے فرد کے ہاتھوں فرد کے استحصال کے خاتمہ کے بغیر قوم کے قوم کے ہاتھوں استحصال کے خاتمے کے امکان کو مسترد کیا ہے۔ کامریڈ لینن نے ایک بظاہر غلام داری اور جاگیرداری نظام کی ریاست میں سوشلسٹ انقلاب کیا ہے۔لیکن انقلاب سرمایہ داری کے خلاف کیا جو وہاں بظاہر معمولی حیثیت کی حامل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اصل دشمن سرمایہ دار ہے۔اُسے شکست ہوگئی تو اس کے طفیلی (پالتو) خودبخود بھاگ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مارکس کا زمانہ دنیا کی حاکم اور محکوم قوموں میں تقسیم کا بھی نکتہ عروج ہے۔لیکن مارکس محکوم قوموں کی حاکم قوموں کے خلاف قومی آزادی کی جدوجہد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مارکس قومی جبر کا قائل ہی نہیں۔ وہ صرف اور صرف طبقاتی جبر واستحصال کے خاتمہ کی جدوجہد کا قائل ہے۔ وہ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی یا تاجِ برطانیہ کے حکمران کو ہندوستان پر انگریز قوم کا قبضہ نہیں سمجھتا۔ وہ اسے سرمایہ دار طبقہ کا قبضہ سمجھتا ہے۔ اُس کی لغت میں ماوراءطبقاتی قوم پرستی جو کہ لازماً نسلی وثقافتی قوم پرستی ہوتی ہے، کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو کے یہ الفاظ ''مزدور طبقہ اپنی ابتدائی جدوجہد میں ریاستی قوم پرست ہوتا ہے کیونکہ اُس کا پہلا ہدف ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ ریاستی اقتدار کی طاقت سے طبقہ سے قوم بننے کی جدوجہد کرتا ہے" غور طلب ہیں۔ اس کے نزدیک ماورا طبقاتی قومی آزادی کی کامیابی محنت کش طبقہ کو کچھ نہیں دے سکتی۔ اس کی گواہی دنیا بھر میں قومی آزادی کی بیشتر کامیاب تحریکوں کے نتائج دے رہے ہیں۔ اقتدار اعلیٰ کی حامل ریاست کے لیے درکار انسانی اور قدرتی وسائل رکھنے والے جغرافیائی خطہ کا محنت کش طبقہ یعنی لاطبقاتی قوم اور قومی ریاست کی تشکیل کر سکتا ہے۔ پیرس کمیون کے لیے یہ کام ممکن ہی نہ تھا۔

مارکس کی زندگی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندوستانیوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان پر قبضہ کے خلاف لڑی۔ مارکس نے اس کی حمایت نہیں کی۔ ۶۶-۱۸۶۰ء امریکہ میں لڑی گئی سول وار کا غلامی کے خاتمہ پر منتج ہوئی۔ مارکس نے اس کا بھی غیر مقدم نہیں کیا۔ لینن نے زار روس کے خلاف محنت کش طبقہ کی طبقاتی لڑائی کی قیادت کی لیکن زار کے خلاف بالٹکس کا ایشیاء اور وسطیٰ ایشیاء میں جاری قومی آزادی، حق خود اختیاری وعلیحدگی کی تحریکوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ماؤ نے سنکیانگ مینچوریا اور منگولیا کی قومی خودمختاری کی تحریکوں کی حمایت نہیں کی بلکہ منچوریا پر جاپانی قبضہ کے خلاف اپنے طبقاتی دشمنوں سے غیر مشروط اتحاد بھی کیا۔ انقلاب چین کے بعد تبت، ہانگ کانگ، مکاؤ اور فارموسیٰ (تائیوان) کی

علیحدگی کو گوارا نہیں کیا۔

ہندوستان پر انگریز سرمایہ دار طبقہ کی حکمرانی میں ہندوستانی حکمران طبقے بھی شریک اقتدار تھے۔ ہندوستانی حکمران طبقہ کے وہ گروہ جو انگریز سرمایہ دار طبقہ کے ساتھ ہندوستان میں شراکت اقدار پر راضی نہ تھے۔ وہ ان کے خلاف ہندوستان کی قومی آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ اگر علی وردی خان، نواب سراج الدولہ، میر قاسم، شاہ عالم ثانی، نواب آصف الدولہ، حیدر علی، ٹیپو سلطان، رنجیت سنگھ، بہادر شاہ ظفر، بخت خان اور سبھاش چندر بوس وغیرہ انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو یہاں کے محنت کش طبقہ کے حالات جوں کے توں ہی رہتے۔ یہ لوگ فرانسیسی سرمایہ دار طبقہ کے ساتھ شراکت اقتدر بنانا چاہتے تھے اور بوس جاپانی سرمایہ دار طبقہ سے ہندوستان کی شراکت اقتدار پر تیار تھے۔ فرانسیسی اور جاپانی ان سے انگریزوں سے بہتر شرائط پر شراکت اقتدار کے لیے تیار تھے۔ فرانس برطانیہ سے بڑی زمینی عسکری قوت تھا۔ لیکن برطانیہ کی بحری برتری نے سمندر پار ممالک میں اسے برطانیہ کے مقابلہ میں سے بے بس کر دیا اور جاپان کو امریکی ایٹمی حملہ لے ڈوبا۔ اس کے نتیجہ میں ان کے ہندوستانی اتحادی بھی مارے گئے۔ باقی دنیا میں بھی یورپی مقبوضات اور نو آبادیاں برطانیہ کی گود میں گرنے پر مجبور ہو گئیں۔

جاگیرداری نظام میں جب ریاستوں نے خود مختار شہنشائیتوں کی شکل اختیار کی تو ریاستی طاقت کا ہراوّل دستہ تجارتی اور فوجی اشرافیہ تھی۔ جاگیردار کی حیثیت محکمہ مال کے ایک تحصیلدار کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ مارکس نے بھی تجارتی اور فوجی اشرافیہ کو خود مختار شہنشائیتوں کا بنیادی پتھر قرار دیا ہے۔ اِس تجارتی اور فوجی اشرافیہ کے مفادات میں نہیں بلکہ بقائی یورپی ترقی یافتہ سرمایہ دار طبقہ کے ساتھ شراکت اقتدار میں تھی۔ اس نے خود مختار شہنشاہیت (مغلیہ) سے وفاداری ترک کر دی۔ انگریزوں کے حق میں اور مخالفت میں ہندوستانی

تجارتی اور فوجی اشرافیائی میں سے کوئی بھی مغلوں کا وفادار نہ رہا۔

ہمارا موجودہ جاگیردا رطبقہ تجارتی اور فوجی اشرافیائی پس منظر کے حامل انگریز سرمایہ دار طبقے کا تشکیل کردہ موروثی جاگیردار ہے۔مغلیہ دور کا جاگیردار عنصر اس میں تقریباً ناپید ہے۔ پنجاب اور سندھ کے جاگیردار طبقہ میں بلوچ، پشتون اور پیر پس منظر والا جاگیردار غالب حیثیت رکھتا ہے۔قبائلی سردار، مذہبی پیشوائیت اور مافیاز بھی سرمایہ دار طبقہ کے طفیلی عناصر ہی ہیں۔ریاستی افسر شاہی اور عالمی سامراجی ادارے بھی سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کے ریاستی اور عالمی محافظ ہیں۔

حکمران طبقہ اپنے طبقاتی مفادات کی لڑائی طبقاتی بنیاد پر لڑتا ہے۔ وہ عوام کو صنف وعمر، رنگ ونسل، مذہب، ملت اور زبان وثقافت وغیرہ کی بنیاد پر ماوراء طبقاتی گروہوں میں تقسیم کرتا ہے اوران کے مابین حقوق وفرائض کے تعین اوران کی عملداری کے تضادات کو بڑھاوادے کر لاتعداد جدوجہدین اورلڑائیاں لڑاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ محنت کش طبقہ کی طبقاتی جبر واستحصال سے نجات کی لڑائی کو بھی محنت کش طبقہ کے گروہی مفادات پر مبنی حقوق وفرائض کی لڑائی میں بدل دیتا ہے۔اس عمل میں پیشہ وارانہ شناختوں جن میں کئی نسلی شناختیں بھی شامل ہوتی ہیں، کو ابھارا جاتا ہے۔طبقاتی صف بندی سے محروم ان تمام لڑائیوں کے پیچھے حکمران طبقہ کے مفادات گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔

حقوق نسواں کی تحریک ماوراء طبقاتی بنیادوں پر منظّم کی جاتی ہے۔محنت کش طبقہ کی خواتین طبقاتی جبر واستحصال کے ساتھ ساتھ صنفی نابرابری کا بھی شکار رہتی ہیں۔حکمران طبقہ کی خواتین طبقاتی جبر واستحصال سے حاصل ہونے والی مراعات میں اپنے طبقہ کے مردوں کے ساتھ حصہ دار ہوتی ہیں۔صنفی جبر کا سامنا بھی انہیں کم ہی ہوتا ہے۔اس طرح محنت کش طبقہ کی خواتین کی صنفی نابرابری کے خلاف جدوجہد کی قیادت ان کے طبقاتی

دشمنوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔اس سے طبقاتی جدوجہد کے ایک بازو کو فالج زدہ کر دیا جاتا ہے۔

پاکستان میں این جی اوز اور حکومتی اداروں کی مدد سے صنفی برابری کی تحریک حقوق نسواں کے نام سے صنفی انقلاب کے دائرے میں داخل ہو رہی ہے۔ بڑی تعداد میں مرد و زن ایک دوسرے کی طرف سے بنائے گئے مقدمات میں جیلیں بھگت رہے ہیں اور اُن کے بچے در بدر بھٹک رہے ہیں۔ اس سے بڑی تعداد عدالتوں اور تھانوں میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہے۔مختاراں مائی کے ریپ ہونے کی سب سے بڑی وجہ اس کا غریب ہونا تھا۔لیکن اُس کے صنفی پہلو کو زیادہ اجاگر کیا گیا۔شیریں رحمٰن، ثاقبہ رحیم الدین، راحیلہ ٹوانہ، بیگم اشرف عباسی، شازیہ مری، بیگم خاکوانی، تہمینہ دولتانہ، حنا ربانی کھر، نیلوفر بختیار، سمیرا ملک، شہزادی عمر زادی، فردوس عاشق اعوان، عابدہ حسین، بےنظیر بھٹو، بیگم نسیم ولی خان وغیرہ انہیں علاقوں سے سرکردہ سیاسی رہنماؤں کے طور پر سامنے آئی ہیں، جہاں سے صنفی ظلم و زیادتی کی زیادہ وارداتیں رپورٹ ہوتی ہیں۔انہوں نے اپنے علاقوں میں عام انتخابات میں مردوں کو شکستوں سے دوچار کیا ہے۔

لاہور، کراچی میں خواتین اس سیاسی حیثیت میں سامنے نہیں آئیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خواتین سے زیادتیوں کے صنفی پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے اور طبقاتی پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیر دست طبقہ کی خواتین طبقاتی جبر و ظلم کے ساتھ ساتھ صنفی جبر و ظلم کا شکار ہوتی ہیں اور اُن کے دکھ میں زیر دست طبقہ کے مرد و زن سب شامل ہوتے ہیں۔ بالادست طبقہ کی خواتین اپنے طبقہ کے مردوں کے ساتھ طبقاتی مراعات سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ انہیں زیر دست طبقہ کی خواتین کی مظلومیت سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ صنفی نہیں طبقاتی ہے۔اس کا حل طبقاتی جدوجہد سے وابستہ ہے۔

زیر دست محنت کش طبقہ کے بچے مشقت اور دوسرے مظالم کا شکار ہوتے ہیں اور اس طبقہ کے بڑے دکھی ہوتے ہیں لیکن مجبور و بے بس تماشائی بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہاں بھی طبقاتی پہلو کو پس پردہ رکھ کر کم سنی کے پہلو کو اہمیت دی جاتی ہے۔ طالب علموں، نوجوانوں، بوڑھوں، مذہبی اقلیتوں اور نسلی ثقافتی قومیتوں کے محنت کش طبقہ کی مظلومیت اور محرومیوں کے طبقاتی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے ماوراء طبقاتی پہلو ہی اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ طبقاتی صف بندی نہ ہونے دی جائے اور ماوراء طبقاتی لڑائیوں میں محنت کش طبقہ کو الجھا کر اور حاصل مصروفیت کا شکار کیا جائے۔

قومی آزادی اور خودمختاری کی جدوجہد طبقاتی اور طبقاتی جبر و استحصال کے خاتمہ کی تحریک (سوشلسٹ تحریک) کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ کیونکہ محنت کش طبقہ کی مقدر ریاست کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کے بغیر سرمایہ داری طبقہ اور سرمایہ دارانہ ملکیت کا خاتمہ ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی ذرائع و آلات پیدوار کی اشتراکی ملکیت کا قیام ممکن ہوتا ہے۔ محنت کش طبقہ زیر سایہ (Domain) ریاست کے اقتدار پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ مقتدر ریاست کے لئے، اس کا جغرافیہ یعنی رقبہ آبادی، وسائل پیداوار کی کمیت و کیفیت اور محل وقوع معروضی شرائط ہوتی ہیں۔ نسلی و ثقافتی قوم پرستی کی تحریکوں کی پُشت پر حکمران طبقہ کے گروہی مفادات گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ تحریکیں محنت کش طبقہ کو چھوٹی چھوٹی نیم خودمختار ریاستوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ان کی قیادت سوشلسٹ انقلاب کی زد میں آنے والے حکمران گروہ کرتے ہیں۔ ان کے مفادات محنت کش طبقہ سے متصادم ہوتے ہیں۔ مصطفٰی کمال کا ترک نیشنلزم، سوئیکارنو کا انڈونیشیائی اور جمال عبدالناصر کے عرب نیشنلزم کے نتائج اس حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں۔

پاکستان میں سندھی، پنجابی، پشتون اور بلوچ قوم پرستیاں بھی اپنی سرشت میں

اسی قسم کے نتائج سمیٹے ہوئے ہیں۔ کشمیری قوم پرستی پر پاکستان کا بایاں بازو خاموشی اختیار کرتا ہے اور حکمران طبقہ اسے اسلامی جہاد کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پاکستانی بائیں بازو کی نظریاتی قیادت تاج برطانیہ کی وفاداری پر فخر کرنے والے جاگیردار خاندانوں کے افراد نے کی۔ یہ لوگ جدید اور قدیم علوم پر اعلیٰ پائے کی دسترس رکھتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر محمد اشرف، سید سجاد ظہیر، سید سبط حسن، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری کے علاوہ بہت سے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ ایک بڑا حصہ تھیوکریسی سے بھی اس میدان میں اترا۔ انہوں نے ہمارے سماج کی حقیقت پسندانہ تعبیر و تشریح کی اور بڑی داد پائی لیکن اسے بدلنے کے لیے رہنمائی کرنے میں ناکام رہے یا گریز کیا۔ نتیجتاً محنت کش طبقہ کی تحریک حکمرانوں کے گروہی مفادات کی لڑائیوں میں تقسیم ہو کر بے نتیجہ ہوگئی۔ حد تو یہ ہے کہ ہندوستان کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور کامریڈ سٹالن نے حمایت کی۔ بعدازاں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھارت کو سوویت یونین سے جوڑ دیا اور CPI نے بٹوارے کی حمایت پر معافی مانگی اور نہرو خاندان کی بغل بچہ پارٹی بننے پر اکتفاء کیا۔

ساٹھ ستر کی دہائیوں میں جب بھارت اور پاکستان کے سوشلسٹ انقلابیوں نے انتخابیوں سے اپنی راہیں جدا کرنا شروع کیں تو اس عمل کی سب سے شدید مخالفت دائیں کی بجائے بائیں بازو کی طرف سے ہوئی۔ طبقہ امراء کے مغربی یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ مارکسٹ پاکستان کی بائیں بازو کی تمام پارٹیوں اور گروہوں میں موجزن ہیں اور سب کے سب طبقاتی مسئلہ کو شاعری کی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ نسلی و ثقافتی قوم پرستی پر مبنی قومی آزادی و خودمختاری کی تحریک پر زور دیتے ہیں۔ پاکستان کو کثیر الطبقاتی کی بجائے کثیر القومی ریاست قرار دیتے ہیں۔ حکمران طبقہ کو بالادست طبقہ کی بجائے پنجاب کو بالادست قوم قرار دیتے ہیں۔ ریاست پاکستان کو حکمران طبقہ کے محنت کش طبقہ کے جبر و استحصال کا

ہتھیار قرار دینے کی بجائے پنجاب کا زیردست قوموں کی آزادی وخودمختاری کے خلاف ہتھیار قرار دیتے ہیں۔ محنت کش طبقہ کی ریاستی اقتدار پر قبضہ کی جدوجہد کی بجائے ریاست توڑ کر زیردست قوموں (ان کے بقول) کو آزادی اور خودمختاری دلانے کی جدوجہد پر زور دیتے ہیں۔ اپنی تنظیموں کے ناموں میں پاکستان کا لفظ شامل کرنے کی مخالفت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ریاست پاکستان زیردست (طبقہ نہیں) قوموں کے خلاف بالادست قوم پنجاب کے جبر کا ادارہ ہے اور زیردست قوموں کے افراد اسے قبول نہیں کرتے۔ انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ پاکستان مسلم لیگ (ن)، پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان تحریک انصاف، پاکستان نیشنل پارٹی (بزنجو)، اگر پختون خواہ، بلوچستان اور سندھ میں مقبولیت حاصل کرسکتی ہیں تو پاکستانی محنت کش طبقہ کی پارٹی کیوں کام نہیں کرسکتی۔ اگر مسئلہ نام کا ہے تو نام میں لفظ ''پاکستان'' تو مسئلہ نہیں ہونا چاہیے ہاں البتہ محنت کش طبقہ مسئلہ ہوسکتا ہے۔ ان حضرات کے قول وفعل کا یہ تضاد بھی ملاحظہ ہو کہ وہ ان قوموں کی اپنی پارٹی تنظیموں کو صوبائی تنظیمیں بھی کہتے ہیں جبکہ انہیں قومی پارٹیاں قرار دیا جانا چاہیے اور قومی پارٹی کی موجودگی میں مرکزی (وفاقی) پارٹی کی کیا اور کس مقصد کے لئے ضرورت ہے یہ معمہ ابھی حل طلب ہے؟ بہرحال اس بات پر ان کا اتفاق ہے کہ وفاقی پارٹی کے نام میں پاکستان کا اضافہ ان کی قومی اکائیوں کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ جبکہ ماضی میں امتیاز عالم، شیر علی باچہ، پروفیسر عزیزالدین اور ماسکونواز کیمونسٹ پارٹی کے مختلف گروہ بھی اسی قسم کی تنظیمیں اور پارٹیاں بنانے کی کوشش کرچکے ہیں۔ پختون خواہ مزدور کسان اور پنجاب لوک پارٹیاں اس کی واضح مثالیں ہیں۔

قدیم زمانہ سے حکمران طبقہ کے طاقتور گروہ دنیا کو ایک ریاست بنا کر اس کی حکمرانی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ اس طبقہ نے بے شمار فرعون، سکندر، قیصر وکسراء، خلیفہ

پوپ شاہ جہان، عالمگیر اور شاہ عالم پیدا کیے۔ تاریخ لکھنے والے حکمرانوں کی عظمت کا تعین فتوحات کے پیمانوں سے کرتے ہیں۔ یہ لوگ March of God on earth ظل الٰہی، سایہ خداوندی اور خدا کے بیٹے بن کر عالمی حکمرانی کے دعوے دار رہتے ہیں۔ آج کے حکمران طبقے (سرمایہ دار) نے اپنی عالمی حکمرانی کی نظریاتی بنیاد ہابز کے نظریہ معاہدہ عمرانی پر رکھی ہے۔ امریکی قیادت میں سرمایہ دار طبقہ کا عالمی حکمرانی کا دعویدار گروہ نئے عالمی معاہدہ عمرانی New world social contract کے حصول کی جدوجہد کا اعلان کرتا ہے۔ یہ حصول محنت کش طبقہ کے ذریعے تو ممکن نہیں ہے۔ وہ دنیا کو چھوٹی چھوٹی کثیر الطبقاتی نیم خود مختار ریاستوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ کہیں مذہبی قوم پرستی کا استعمال کرتے ہیں اور کہیں نسلی و ثقافتی قوم پرستی۔

دوسری جانب مارکس نے محنت کش طبقہ کو اس کے برعکس راستہ دکھا دیا ہے۔

سرمایہ دار طبقہ عالمی طبقاتی مفاہمت اور محنت کش طبقہ عالمی طبقاتی تصادم، سرمایہ دار طبقہ ماوار طبقاتی تصادم اور محنت کش طبقہ ماوراطبقاتی مفاہمت، سرمایہ دار طبقہ، مذہبی، نسلی، وثقافتی قوم پرستی اور محنت کش طبقہ جغرفیائی ریاستی اور طبقاتی قوم پرستی، سرمایہ دار طبقہ دنیا کی نیم خودمختار قوموں اور ریاستوں میں تقسیم ہے اور محنت کش طبقہ دنیا کی خودمختار قوموں اور ریاستوں میں تقسیم ہے۔ سرمایہ دار طبقہ عالمی معاہدہ عمرانی کے تحت کثیر الطبقاتی سماج اور یک ریاستی دنیا کا قیام اور محنت کش طبقہ، مارکسی فلسفہ کے تحت لاطبقاتی سماج اور لاریاستی دنیا کا قیام، سرمایہ دار طبقاتی تفریق کو مقابلہ ومسابقت کے ذریعے محنت کی تحریک اور ترقی کو کلید قرار دے کر بڑھاوا اور مسائل وحالات پیداوا کی استحصالی کی ملکیت کی آبیاری جبکہ محنت کش طبقہ، طبقات اور طبقاتی جبر واستحصال کا خاتمہ اور وسائل آلات وپیدوار کی استحصالی ملکیت کی جگہ اشتراکی ملکیت کا قیام چاہتا ہے۔

بڑھتے ہوئے طبقاتی تضاد سے نبرد آزما ہونے کے لیے حکمران طبقہ کی عالمی طاقت کا ایک ریاست میں منظّم ہونا ضروری ہے۔ جبکہ طبقاتی تضاد کے خاتمہ کے نتیجہ میں ریاست کا بے مصرف ہوکر خاتمہ لازمی ہے۔ نیم خودمختار اور خودمختار (مقتدر) قوم وریاست کی معروضی شرط اس کا جغرافیہ ہوئی ہے۔ اگر جغرافیہ مقتدر ریاست کی بنیاد فراہم نہیں کرتا تو قوم وریاست کے مقتدر ہونے کا تمام دعوے لغو ہوتے ہیں۔ متذکرہ بالا پیرامیٹرز کو سامنے رکھ کر ہم بآسانی یہ تعین کر سکتے ہیں کہ کون لوگ محنت کش طبقہ کی سیاست کر رہے ہیں اور کون حکمران طبقہ کی۔

سوچ (Thought) خیالات (Ideas) پیدا کرتی ہے۔ خیالات کا ایک منظّم مجموعہ جو کسی عمل کے لیے راستہ دکھاتا ہے (Idealogy) کہلاتا ہے۔ اگر یہ آئیڈلوجی مزید تحقیق کے نتیجہ میں قابل عمل (Feasible) قرار پاتی ہے تو اسے فلسفہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب یہ فلسفہ اپنی عمل پذیری کی معروضی شرائط پوری کر لیتا ہے اور عمل پذیری کے لیے صرف موضوعی شرائط کا طلب گار ہوتا ہے۔ تو یہ نظریہ (Theory) بن جاتا ہے جو کہ جدوجہد کا متقاضی ہوتا ہے۔ ناقابل عمل آئیڈیالوجی یا معروضی شرائط کی عدم موجودگی کے باعث ممکن عمل فلسفہ کسی جدوجہد کا متقاضی نہیں ہوتا۔

نسلی ثقافتی قوم پرستی (Ethno-cultural Nationalism) کی سیاست محنت کش طبقہ کو ماوراطبقاتی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی سیاست ہے اور حکمران طبقہ کے گروہی مفادات کے تصادم کا ایک حصہ بھی ہے۔ حکمران طبقہ کا بڑا گروہ اسے اپنے مفادات کے خلاف گردانتے ہوئے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ہم اسے محنت کش طبقہ کی انقلابی طاقت کی تقسیم قرار دے کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس بڑے حکمرانی گروہ کے اتحادی ہیں بلکہ ہم محنت کش طبقہ کی متحدہ بڑی انقلابی قوت سے اس بڑے

حکمران گروہ کوشکست دینااپنی اوّلین ترجیح قرار دیتے ہیں۔

پاکستان کے کسی حصہ میں نسلی وثقافتی قوم پرست تحریک مقتدر ریاست قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔اس کی قیادت سرمایہ دار طبقہ کرتا ہو یا محنت کش طبقہ۔ ہمارے دور کا حکمران طبقہ عالمی طبقہ ہے اور ہر ریاست کے سیاسی اقتدار میں عالمی اور ملکی حکمران طبقہ کے گروہ حصہ دار ہوتے ہیں۔ہم ان کے خلاف الگ الگ مرحلہ وار جدوجہد نہیں کر سکتے۔ہم ان کی شراکت داری توڑ نہیں سکتے۔ملکی حکمران عنصر قوم کہلاتا ہے۔ریاستی اقتدار میں ملکی اور عالمی حکمران طبقہ کی شراکت کے تناسب سے کسی ریاست کو خودمختاری،قومی زیر سایہ نوآبادیاتی یا مقبوضہ غلام ریاست قرار دیا جاتا ہے۔لینن،ماؤ،کاسترو،کم ال سنگ اور ہوچی منہ نے عالمی حکمران عنصر اور ملکی حکمران عنصر کے خلاف قومی آزادی وخودمختاری اور طبقاتی جبر استحصال سے نجات کی لڑائیاں الگ الگ نہیں لڑیں۔ہم نے قومی آزادی اور خودمختاری کی لڑائی طبقاتی جبر واستحصال سے نجات کی لڑائی سے الگ کر کے لڑی ہے۔ عالمی سیاسی حالات نے ہمیں آسانی سے کامیابی دلادی لیکن حکمران طبقہ کے ملکی عنصر کے ریاستی اقتدار میں حصہ داری کو بڑھاوا ملا اور طبقاتی جبر استحصال اور شدید ہوا۔ملکی حکمران طبقہ اور زیادہ مضبوط ہوگیا اور محنت کش طبقہ کے لیے ریاستی اقتدار پر قبضہ کے ذریعے قوم بننے اور طبقات اور طبقاتی جبر واستحصال سے نجات کا راستہ اور مشکل ہوگیا۔

آج کا حقیقی حکمران طبقہ (بلاتفریق ملکی و عالمی) سرمایہ دار طبقہ ہے۔ جاگیر دار قبائلی سردار،تھیوکریسی اور مافیاز سابقہ ادوار کے حکمران طبقات کی باقیات ہیں اور درمیانہ طبقہ کی بالائی پرت کے طور پر سرمایہ دار طبقہ کے طفیلی اتحادی بن کر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خودمختار بادشاہتوں کے بھی وظیفہ خوار تھے۔ جب خودمختار بادشاہتوں کو سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں شکستوں کا سامنا ہوا تو نئے حکمران طبقہ کے وفادار بن کر وظیفہ خوار

ٹھہرے۔ یہ طفیلی اتحادی اپنے بالا دست طبقہ کی شکست کے نتیجہ میں صرف وفاداری بدلنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ان میں مزاحمت (اپنے دم خم پر) کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر محنت کش طبقہ انہیں اپنی بالا دست قوت کی سرپرستی اور پشت پناہی سے محروم کیے بغیر سرمایہ دار طبقہ کے ان طفیلی اتحادیوں کے خلاف لڑتا ہے تو یہ نا قابل شکست ہوتے ہیں۔ایسی لڑائی سرمایہ دار طبقہ کو اور زیادہ طاقتور کر دیتی ہے۔ یہ مرکر بھی سرمایہ داری نظام کی مضبوطی کا باعث بنتے ہیں۔

بھارت میں زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیرداری کا خاتمہ کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں کسان خودکشیاں کر رہے ہیں اور سرمایہ دار اور اس کی جمہوریت مستحکم ہوئی ہے۔ سیکولر سیاست نے مذہبی قوم پرستی کے ہاتھوں منہ کی کھائی اور اقلیتیں فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں جلنے لگیں۔ سرمایہ دار نواز تھیوکریسی اقتدار میں آئی اور بھارت کی سیاسی اور معاشی وابستگی کا رخ روس سے امریکہ کی طرف موڑ دیا۔اب امریکہ اور مغربی یورپ کی سیاسی ہواؤں سے بھی اسی قسم کی بُو آ رہی ہے۔

ہمارے ہاں تضادات کی صورت حال بڑی پیچیدہ اور مسلسل کمیتی اور کیفیتی تبدیلیوں کی زد میں ہے کسانوں کی ملکیت زمین اور حقوق وراثت اور آپس میں تضادات طویل مقدمہ بازیوں اور قتل وغارت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کھالوں کی وارابندیوں اور گزرگاہوں پر تنازعات ان کی توانائیوں پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ برصغیر میں کسان تحریک سب سے پہلے ملکیت زمین کے مطالبہ پر وجود میں آئی۔ یہ کسان اور ریاست کا تضاد تھا اور جاگیردار ریاست کے ساتھ کھڑا تھا۔ کیونکہ ریاست ملکیت زمین کسان کی بجائے جاگیردار کو دینا چاہتی تھی۔اس لڑائی میں ہزاروں کسانوں نے جانیں دی اور قید وبند کی اذیتیں جھیلیں۔اس تحریک کا سرا حقوق مزارعیت کے مطالبہ پر تھا اور یہ بے مالک کسان اور

جاگیرداروں کا تضاد تھا اور ریاست جاگیردار کی پشت پناہی کرتی تھی۔

ایک طرف بار بار کی زرعی اصلاحات اور قوانین وراثت کے تحت زمینوں کی تقسیم در تقسیم نے مالکان کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ کیا اور دوسری طرف آلات پیداوار کی ترقی نے زراعت میں مشینی کاشت اور میکاناٹائزڈ فارمنگ کو بڑھاوا دیا۔ نتیجۃً بے مالک کسان کا خاتمہ ہوا اور زراعت سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور پیدواری رشتوں سے روشناس ہوئی۔ اب جاگیرداروں کی زمینوں پر کسان نہیں مزدور کام کرتے ہیں اور ان میں ایک بڑی تعداد پیشگی کے قیدی مزدوروں کی شامل ہے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ اب بڑے زمینداروں کے میکناٹائزڈ فارمز، ٹھیکیداروں کے فارمز، ڈیری فارمز، میٹ، مٹن، اور بیف فارمز، پولٹری بریڈنگ، ایگ اور چکن فارمز، فش بریڈنگ اور فوڈ فارمز، فروٹ فارمز اور گریڈنگ اینڈ پروسیسنگ انڈسٹری اور زرعی شعبے ہیں جہاں سرمایہ دارانہ طریقہ پیدوار رائج ہو چکا ہے۔ ان میں مستقل مزدوروں کے ساتھ ساتھ موسمی اور وقتی مزدوروں کے گروپ بھی مصروف عمل رہتے ہیں۔ مثلاً نکاسی، نئے بیج کے لیے فارمز کی تیاری کے مراحل میں یہ کسی ایک فارم سے غیر منسلک گروپ کام کرتے ہیں۔ کارپوریٹ فارمنگ بھی متعارف ہو رہی ہے لیکن ابھی قابل حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ چھوٹے قطعات زمین کے مالک کسانوں کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ کاشتکاری کے لیے گھریلو محنت پر انحصار کرتا ہے۔ ایک حصہ اپنی وافر محنت دوسروں شعبوں کو بیچتا ہے اور ایک حصہ مستقل جز وقتی محنت کا خریدار بھی ہے۔ یہ زرعی مداخل کے خریدار اور زرعی پیداور کے چھوٹے چھوٹے فروخت دار ہوتے ہیں۔ منڈی میں انہیں اتنی مار پڑتی ہے کہ ان کی محنت بے توقیر ہو جاتی ہے۔ متذکرہ بالا فارموں کو بھی (INPUTS) کی مہنگائی اور پیداوار کی ارزانی کا مسئلہ درپیش رہتا ہے۔ شوگر انڈسٹری کے مالکان نے جدید مشین اور ٹیکنالوجی سے آراستہ کین فارمز بنائے لیکن

مداخل کی مہنگائی کے باعث انہیں اپنا پیدا کردہ گنا کسانوں کے گنے سے مہنگا پڑا اور انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ ترقی یافتہ صنعتی ممالک زراعت کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہے۔ ترقی یافتہ مداخل کی وجہ سے زرعی پیداوار تو بے تحاشا ہوئی ہے لیکن مداخل کی مہنگائی کی وجہ سے وہ اتنی مہنگی ہو جاتی ہے کہ زراعت سبسڈی کے بغیر زندہ رہنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک غریب ملکوں پر زرعی سبسڈی کے خاتمہ کے لیے زور دیتے ہیں۔ لیکن اپنے ملکوں میں ایسا کرنے سے انکاری ہیں۔ پاکستان میں کارپوریٹ فارمنگ کے فروغ میں بھی یہی رکاوٹ درپیش ہے۔ زرعی سبسڈی کسانوں کو خوشحال کرنے کے لیے نہیں دی جاتی اس کا اصل مقصد سرمایہ دارانہ سیاست کو چمکانا اور زرعی مداخل کی صنعت و تجارت سے وابستہ سرمایوں کو تحفظ دینا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار زرعی شعبہ سے مزدوروں کو معقول اجرت دینے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔ یہ صورتحال محنت کشوں کی دیہاتوں سے شہروں کو نقل مکانی کا سبب بنتی ہے۔

دیہات اور شہر کا تضاد بھی موجود ہے۔ صحت، تعلیم اور سرکاری دفاتر و عدالتیں وغیرہ کی سہولتیں شہروں میں موجود ہیں اور دیہاتیوں کو ان سے استفادہ کرنے کے لیے طویل مسافت طے کرنا پڑتی ہے، وقت اور اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ پیداواری مداخل اور روزمرہ استعمال کی اشیاء و خدمات بھی شہروں سے دیہاتی صارفین تک جاتے جاتے مہنگی ہو جاتی ہیں۔ دیہی پیداوار بھی شہری منڈیوں سے گزر کر دیہی صارفین کو ملتی ہیں۔ ہوا، پانی اور سورج کی روشنی اور حرارت دیہاتیوں کو بہتر معیار کی میسر ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی سے دیہاتی کم متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی معمولی فوقیت نہیں ہے۔ ساگ پات اور جلانے کی لکڑیوں کی ارزانی بھی دیہی زندگی کے لیے مددگار ہے۔ خالص خوراک کے حصول میں بھی شہری محنت کش طبقہ سے دیہی بہتر ہیں۔ لیکن یہ بہتری بھی زوال پذیر ہے۔ پاکستان کے صحرائی

اور نیم صحرائی پہاڑی علاقوں میں غلہ بانی، آبی ذخیروں گزرگاہوں اور ساحلوں پر ماہی گیری ، پہاڑی اور میدانی جنگلات اور معدنیات کے شعبوں سے وابسطہ محنت کش طبقہ انتہائی کسم پرسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے ایجنٹوں اور ٹھیکداروں کی وساطت سے ان کا خون پوری طرح نچوڑ رہا ہے۔ صنعت وتجارت کے شعبہ میں طبقاتی تقسیم پیچیدہ ترین صورت حال اختیار کر چکی ہے میں اسکی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ میں نے سادہ طبقاتی تقسیم کے شعبوں پر بات کی ہے۔ ان کے بارے میں یہ تذبذب پایا جاتا ہے کہ یہ شعبے سرمایہ کاری کی زد میں ہیں یا نہیں۔ ہمارا سماج تضادات کا پنڈورا باکس ہے۔ اور ایسا ہر سماج میں ہوتا ہے۔ لیکن اصلی اور بنیادی تضاد صرف اور صرف سرمایہ ومحنت کا تضاد ہے ہماری طبقاتی جدوجہد بالادست سرمایہ کار طبقہ کے خلاف محنت کش طبقہ کی جدوجہد ہے۔ سرمایہ دار کسان، گلابان، ماہی گیر، کان کن اور جنگلات میں کام کرنے والوں کی محنت دراصل پیدوار کی گرانی اور ان کی پیدوار کی ارزانی پیدا کر کے لوٹتا ہے۔ ان شعبہ کے سرمایہ دار میں بالادست سرمائے کے ہاتھوں حالت نزاع میں رہتی ہے نچلی درمیانی پرتوں کے ڈاکٹر ، انجینئر ، استاد، وکیل ، دکاندار، اہل فن، ادیب، شاعر، صحافی ،کلرک دونی چونی کے مزدور بنا دیے گئے ہیں۔ اس طبقہ نے پورے معاشرے کو مہنگائی کی آگ میں جھلس کر رکھ دیا ہے۔

یہ سرمایہ دار طبقہ دوصدیوں سے ہمارے خطہ کے ریاستی سیاسی اقتدار پر قابض ہے۔ اور ہمارے دانش ور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ محنت کش طبقہ کے ریاستی اقتدار پر قبضہ کی لڑائی سرمایہ دار کے خلاف لڑنا ہے یا جاگیر دار کے خلاف۔ طبقاتی جبر استحصال کے خاتمہ کے لیے طبقات کا خاتمہ کرنا ہوگا جو کہ محنت کش طبقہ کے ریاستی اقتدار پر قبضہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمارا پہلا حدف ریاستی اقتدار کا حصول ہے۔ ہم کسی کو اپنا حدف تباہ کرنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ ماؤ نے ریاست چین کو خطرہ کی صورت میں ریاستی اقتدار پر قبضہ کی لڑائی کو

ملتوی کر کے ریاست کے تحفظ کی لڑائی ریاستی حکمران طبقہ سے غیر مشروط اتحاد کر کے لڑی۔ ریاستی اقتدار محنت کش طبقہ کے ہاتھ لگتا دیکھ کر حکمران طبقہ ریاست تباہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور محنت کش طبقہ کو یہ کوشش بھی ناکام بنانا ہوگی۔ ریاست حکمران طبقہ کا ہتھیار ہے۔ اگر جنگ میں اپنے ہتھیار دشمن کے ہاتھ لگنے والے ہوں تو انہیں خود تباہ کر دینا جنگ کا اہم اصول ہے۔ ایسی صورت میں دشمن کے ہتھیاروں کو تباہ ہونے سے بچانا ہماری ذمہ داری بن جاتی ہے۔ جو کہ خلاف معمول بات ہے۔ ریاستی اقتدار اور دشمن کا ہتھیار ہی نہیں اس کا حصول محنت کش طبقہ کا حدف بھی ہے۔ محنت کش طبقہ اپنے حدف کے حصول کے لیے طویل جدوجہد کر سکتا ہے اسے تباہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ حکمران طبقہ اسے تباہ کرنے کے لیے دروازے کھلے رکھتا ہے تا کہ بوقت ضرورت ایسا کیا جا سکے۔ پاکستان کا بایاں بازو اس مسئلہ پر حکمران طبقہ کا ہمیشہ مددگار رہا ہے۔ حکمران طبقہ کی کمانڈ پوسٹ سرمایہ دار ہے۔ اس پر حملہ کرنا محنت کش طبقہ کی اولین ترجیح ہونا چاہیے۔ ہمارے دانش وروں نے اس کے حسن جمال کا ایسا نقشہ کھینچ رکھا ہے کہ اس پر حملہ کی بجائے اس سے عشق کرنا ہمارا شعار بن گیا ہے۔ اس کو عوام میں تنہا کرنے کی بجائے اس کے اتحادی بن جاتے ہیں۔ دشمن کی کمانڈ پوسٹ تباہ کرنا ہر فریق جنگ کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار (LESSER EVIL) نہیں ہے کہ اس سے اتحاد کر کے دوسرے دشمنوں کے خلاف لڑا جائے۔

ہم نے ہشت نگر، جھل جھاؤ، اواران، سون میانی، بنگلہ اچھا، ڈہرانوالی، اوکاڑہ، ظفر پور شالی، کالا باغ، لانڈھی کورنگی، کالونی مل ملتان، کالا شاہ کاکو، کوٹ لکھپت، پٹ فیڈر سہگل فارم وغیرہ میں محنت کش طبقہ کے تسلیم شدہ حقوق کے لیے آواز بلند کی ہماری جدوجہد ریاستی اقتدار پر قبضہ کے لیے نہ تھی۔ لیکن ہمارے دشمنوں نے ہمارے حقوق مزارعت اور مزدوری کی جدوجہد کو تشدد کے ذریعے موت یا مالکی کی لڑائیوں میں بدل دیا اور ہمارے حصے

میں موت ہی آئی۔

اس وقت سرمایہ دار کی بڑھتی ہوئی لوٹ مار سے پریشان اور اس کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت سے خوف زدہ عوام کا بہت بڑا ہجوم محنت کش طبقہ کے ساتھ سرمایہ دار کے ساتھ لڑنے کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے محنت کش طبقہ کو تین شرائط پوری کرنا ہوگی۔

۱۔ محنت کش ایک منظّم انقلابی سیاسی قوت کے طور پر اپنا وجو قائم کرے۔

۲۔ مزید یہ کہ جدوجہد صرف اور صرف ریاست پاکستان کے سیاسی منظر پر فائز سرمایہ دار طبقہ (بلاتفریق ملکی وغیر ملکی وعالمی) کے خلاف فوکس کرے۔

۳۔ اس جدوجہد کے خلاف تخریبی عزائم رکھنے والوں اور ایسے عناصر جن سے عوام نفرت کرتی ہوں کو صرف بے ضرر رکھنے کی حکمت عملی اختیار کرے۔

# پاکستان میں قومی تشخص کا بحران

تشخص کے ضمن میں سب سے پہلی بات ہوگی نام کی اور نام تو ہمارا بہت اچھا خاصا موجود ہے۔ پاکستان۔۔۔مگر پاکستان ہے کیا ہم کون ہیں؟ ہمارا ماضی کیا تھا؟ ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟ ہم کیا تھے؟ کیا بن گئے ہیں؟ کیا بننا چاہتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر کسی کو پریشان کرر ہے ہیں۔ان سوالوں کا جواب ہمیں دینا ہی ہوگا کہ بقول ایلیٹ ''خاتمہ کہیں نہیں ہے،صرف اضافہ ہے؟ مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو۔'' پہچان کہ اس انداز کو بلھے شاہ نے یوں کہا ہے ''بلھیا کی جاناں میں کون؟'' اور بلھے شاہ کا یہ کرب جو ہمہ جہت ہے ہمارا بھی کرب ہے اس کا ایک ہمہ جہت جواب ہی ہمارا تشخص ہوسکتا ہے اور یہ تشخص تاریخی،جغرافیائی،سماجی،ثقافتی اور نفسیاتی ہوگا۔اس بارے میں بہت تحقیق،تلاش اور جانچ پڑتال کی ضرورت ہے اور یہ ہمیں خود ہی کرنا ہوگی کیوں کہ اب تو ہماری قومی اسمبلی بھی یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ آسمانوں سے ہدایات آنا بند ہوچکی ہیں اور ایمرجنسی جنریٹر بھی کام نہیں آتا۔۔۔۔۔یہ بھی ہمارے تشخص کے بحران کا ایک بڑا سبب ہے!

اس بحران کے سلسلے میں تحقیق کے بارے میں ماؤ کہتا ہے:

"تحقیق حمل کے طویل دنوں کی طرح ہوتی ہے اور کسی مسئلے کا حل ولادت کے دن کی طرح ہوتا ہے۔ دراصل کسی مسئلے کی تحقیق کرنا اس کو حل کرنا ہوگا۔"

ایک قوم کی تعمیر وترقی میں تشخص کی اہمیت وہی ہے جو ایک عمارت کی تعمیر میں بلیو پرنٹ کی۔ تشخص چونکہ زندگی کے سبھی پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس لیے اس کے سبھی پہلوؤں پر تحقیق وجستجو کے بعد جو جواب مرتب ہوگا، وہ بہت پہلودار اور بسیط ہوگا۔ امرت دھارا قسم کے فلسفے کام نہیں آتے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ مسلمان کون سا کلمہ پڑھتے ہیں تو میرا جواب ہوگا لا الہ الا اللّٰہ۔۔۔ اور شاید ہی کوئی اس سے اختلاف کرے، مگر جب میں یہ پوچھوں پاکستان کا جغرافیہ کیا ہے؟ یا پاکستان کا حدود اربعہ کیا ہے؟ پاکستان کی تاریخ کیا ہے؟ پاکستان کی ثقافت کیا ہے؟ پاکستان کی زبانیں کون سی ہیں؟ پاکستان میں کون سی نسلیں آباد ہیں؟ (اور یہ نسلیں اداس کیوں ہیں؟) پاکستان کا معاشی ڈھانچہ اور معاشرتی نظام کونسا ہے؟ یعنی پاکستان کا مطلب کیا ہے؟۔۔۔ اور آپ جواب دیں لا الہ الا اللّٰہ ۔۔۔ تو اس سے ممکن ہے کہ آپ کو اردو اخبار میں انگریزی لکھنے کی نوکری مل جائے مگر مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملے گا! کیا میں اس سے یہ سمجھوں کہ جس ملک کے جھنڈے پر لا الہ الا اللّٰہ لکھا وہ پاکستان کا پانچواں صوبہ ہے یا یہ سمجھوں کہ ہر کلمہ گو کو پاکستانی پاسپورٹ کیلئے درخواست دینی چاہیے یا یہ سمجھوں کہ واہگہ کے اس پار لا الہ الا اللّٰہ پڑھنے والے پاکستانی ہیں اور واہگہ کے اس پار رہنے والے غیر مسلم پاکستانی نہیں ہیں۔ کیا پاکستان کے شہری حقوق رکھنے والے یہ لوگ، جو دنیا کے کسی بھی قانون اور ضابطہ اخلاق کے مطابق پاکستانی شہری ہیں صرف اس لیے پاکستانی نہیں کہ وہ لا الہ الا اللّٰہ نہیں پڑھتے۔۔۔ یہ غیر منطقی سوچ اور عصبیت بھی سبب ہے تشخص کے بحران کا۔ کیا یہ لوگ قائداعظم کے سبھی ارشادات

بھول گئے ہیں میں ان میں سے چند ایک دہراتا ہوں۔

''تم میں سے ہر ایک، خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ خواہ کوئی سا رنگ ،ذات عقیدہ رکھتا ہو، اولاً ثانیاً اور بدرجہ آخر اس مملکت کا شہری ہے۔ برابر حقوق اور برابر مراعات کے ساتھ''

(محمد علی جناح کی تقریریں اور تحریریں حصہ دوم، ص ۴۰۲)

''آپ کسی مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلق رکھیں۔ اس کا کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں ۔۔۔۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلم مسلم نہیں رہیں گے۔ سیاسی معنی میں ''مملکت کے شہریوں کے طور پر۔''  (محمد علی جناح کی تقریریں اور تحریریں حصہ دوم ۴۰۳)

قائداعظم کے رد میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی فرماتے ہیں: ''اگر عرب عرب رہیں گے، تُرک تُرک رہیں گے، ایرانی ایرانی رہیں گے مگر ہم کچھ نہیں رہیں گے''

مائی ڈیئر ڈاکٹر قریشی! ہم وہی رہیں گے جو ہم ہیں۔ اس سلسلے میں چند اسناد پیش کرتا ہوں کہ بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر!

ڈاکٹر بی اے امبید کر نے کہا ہے:

''پاکستان کے خیال میں کوئی نئی یا اچانک چیز نہیں ہے۔ صرف یہی ہوا ہے کہ جواب تک بالواسطہ تھا، اب بین ہے۔ پوری چمک کے ساتھ اور جواب تک بے نام تھا۔ ایک نام اختیار کر چکا ہے۔''

احمد عبداللہ کہتا ہے:

''قراقرم سے بحیرہ عرب اور ستلج سے کوہ ہندوکش تک ایک قطعہ زمین، اپنی

تاریخ، اپنا کلچر، ایک سی آبادی بلا چھوت چھات، سماجی نظام، بہت سی تہذیبوں کا دیس، آمری نال، ہڑپہ، گندھارا، بلخی وغیرہ۔۔۔۔

ہندوستان کی اس علاقے پر حکومت استثناء ہے پاکستان کا قیام کوئی نئی بات نہیں بلکہ اصل کی طرف رجوع ہے۔''

اور اسی سلسلے میں وہیلر نے اپنی کتاب ''پاکستان کے پانچ ہزار سال'' میں لکھا ہے:

''اس کتاب کے عنوان میں جان بوجھ کر تضاد پیدا کیا گیا ہے، مگر اس میں ایک بنیادی سچائی موجود ہے۔ پاکستان ایک نئی اسلامی مملکت ہے مگر اپنے قدیم ہمسایوں کی طرح یہ بھی تاریخی عوامل کی پیداوار ہے جن میں اسلام سب سے بعد کا عمل ہے۔''

قوم کا تصور ایک سیاسی تصور ہے اور سرمایہ داری دور کی پیداوار ہے جب ایک مشترکہ منڈی کو دوسروں کے مقابلے میں تحفظ دینے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس معنی میں ایشیاء اور افریقہ کی کئی مملکتوں میں ابھی تک قوموں کا ظہور نہیں ہوا (روپرٹ ایمرسن) محض امید پیدا ہوئی ہے یا یوں کہ لیجیئے کہ امید قوم ہے۔ پاکستان میں یہ عمل بہت تیزی سے جاری ہے۔

پاکستان بننے کے بعد شہروں کا پھیلاؤ، نئے شہروں کا قیام، آبادی کا رزق کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، معیشت، صنعت اور ثقافت کی ترقی، یہ سبھی عوامل مل کر ایک قوم کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ٹرانسسٹر ریڈیو اور قومی سطح پر چھپنے والے اخبارات و رسائل نہ چاہتے ہوئے بھی اس عمل کو اور تیز کر رہے ہیں۔ ایک جیسی مصنوعات بھی علاقائی فرق کو کم سے کم کرتی ہیں۔ خیبر سے کراچی تک آپ کی تنہائی کی ساتھی، آپ کی سگریٹ کے ٹو ہے اور جب آپ کو چائے کی ضرورت ہو تو لپٹن عمدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی

ساتھ سرمایہ دار طبقے کی اپنی ایک مشترکہ تہذیب، بمقابلہ عوام وجود میں آ رہی ہے۔ جو پی۔ آئی۔ اے، انٹر کانٹینٹل ہوٹلوں، ریل کے ائیر کنڈیشنڈ ڈبوں، ان کی ہاوسنگ سوسائیٹیوں اور ان کی سیاسی جماعت میں نظر آتی ہے۔ وہ بھی خیبر سے کراچی تک ایک ہی تہذیب، خیر! یہ دوسرا مسئلہ ہے۔ ہر طبقاتی سماج میں دو تہذیبیں ساتھ ہی ساتھ چلتی ہیں۔ ایک حکمرانوں کی تہذیب و ثقافت، دوسری عوام کی۔ اس فرق سے آنکھیں چرانا بھی تشخص کے بحران کا ایک سبب ہے۔

اس سرمایہ دارانہ دور کے تصور قوم سے قدیم تر تصور اس اجتماع کا ہے جس کو آج کی اصطلاح میں قومیت کہتے ہیں۔ یہ اجتماع اس وقت وجود میں آیا جب ایک یا ایک سے زیادہ قبیلے ایک قطع زمین سے متعلق ہوئے اور مشترکہ حکومت کے تحت آ گئے۔ یا یوں کہیں کہ جاگیرداری دور میں۔ اس سے پچھلے دور یعنی غلام داری سماج میں جب ذرائع پیداوار اس قدر ترقی کر گئے کہ شہروں کا قیام ممکن ہوا تو لوگوں کی خانہ بدوشی ختم ہوئی۔ اب وہ ایک علاقے سے متعلق ہو گئے جس کے نتیجے میں تہذیب پیدا ہوئی۔ Civis شہر کو کہتے ہیں اور Civilization اس سے متعلق ہے۔ ایک جگہ رہائش سے مشترکہ زبان اور مشترکہ تہذیب پیدا ہوئی اور لوگوں کا طریق حیات ایک سا ہو گیا۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد اسی دور میں پڑ گئی تھی۔ خواہ وہ چینی تہذیب ہو، یونانی تہذیب ہو، مصری تہذیب ہو، یا ہڑپائی تہذیب موخر الذکر Proto-indus یا دریائے سندھ سے متعلق تہذیب و ثقافت کی بنیادیں اسلام کے آنے سے پہلے ہی استوار ہو چکی تھیں۔ بعد میں ہونے والی سیاسی اور مذہبی تبدیلیوں کے باوجود کوئی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ آج کی عرب تہذیب تو عرب تہذیب ہے مگر اسلام سے قبل کی تہذیب عرب تہذیب نہ تھی۔ یہ تہذیبی تسلسل دنیا بھر کے عالموں کو نظر آتا ہے۔ مگر ہمارے عالم اس تسلسل سے انکاری ہیں۔ یہ شپرہ چشمی بھی تشخص کے بحران کا ایک

سبب ہے۔ظاہر ہے اس میں چشمہ آفتاب کا کیا گناہ۔

گزشتہ دنوں زرعی یونیورسٹی لائل پور میں ایک سائنس کانفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں آثار قدیمہ کے ایک ممتاز ماہر فضل احمد صاحب نے ایک نہایت عمدہ مضمون ہڑپہ تہذیب پر پڑھا۔ تاریخی شواہد پیش کیے، سلائیڈیں دکھائیں اور یہ ثابت کیا کہ ہماری آج کی تہذیب کی بنیادیں ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں رکھی جا چکی تھیں۔تمام ثقافتی مظاہر یعنی عمارات، لباس، سامان، آرائش وغیرہ میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں جو آج سے ملتی جلتی شکل میں اس وقت موجود نہ تھی۔ سرمہ، کاجل، سرمے دانی، ہار کنگن، سبھی کچھ تو تھا حتی کہ پیپل کا پتہ بھی کیونکہ پیپل کی دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ آج کل ٹرکوں اور موٹروں کی پیشانی پر پیپل کا پتہ بنا کر اس پر یا اللہ، یا محمد لکھا ہوتا ہے۔ ہمارے ایک مرحوم فاضل اس مضمون پر تبصرہ کرنے اٹھے، فرمایا: اچھا مضمون ہے بہت اچھی ریسرچ ہے اور بہت زیادہ عرق ریزی کی ہے مگر۔۔۔ مگر یہ تہذیب ہماری تہذیب نہیں ہے۔ زندہ باد سائنس کانفرنس اور زندہ باد سائنس، سائنس یونہی شواہد سے نتائج اخذ کرتی ہے! یہ الٹ بازی اس لیے تھی کہ وہ صاحب بدقسمتی (ہماری) اردو بولنے والے علاقے سے مہاجر تھے اور اس دھرتی سے جس نے انہیں پناہ دی تھی۔ گھر دیا تھا، اپنا رشتہ جوڑنے کو تیار نہ تھے۔

جب حقیقت روایات میں کھو جائے تو امتیں ایسے ہی خرافات میں کھو جاتی ہیں۔ انہیں خرافات میں سے ایک برصغیر کا آریائی تشخص ہے۔ جو انگریز کی حکمرانی کا جواز مہیا کرنے کیلئے گھڑا گیا تھا کہ یہ وحشی قبائل کا ملک تھا دھات اور پتھر کے زمانے کے فوراً بعد آریا تشریف لے آئے اور اپنے جلو میں تہذیب وثقافت زبان خدا جانے کیا کچھ لائے اور اصل بات تو یہ ہے کہ ایک ہندوستان کا تصور لائے۔ ان خدا کے بندوں سے کون پوچھے کہ بھائی! تاریخ کے کس دور میں ہندوستان ایک وحدت رہا ہے۔ مقصد صرف ثابت کرنا تھا کہ

ہندوستان ایک ملک ہے۔آریائی اس میں برتر تہذیب سمیت آئے تھے اور ہم انگریز بھی پانچوں سواروں میں ہیں یعنی آریائی ہیں۔اگر ہم تم پر حکومت کر رہے ہیں تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہونا چاہیے۔ یہ وہی سامراجی منطق تھی جو آج کل باباغفور وف کو تنگ کر رہی ہے۔فرماتے ہیں کہ آریاؤں نے ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی عظیم تہذیب کو تاراج نہیں کیا تھا۔وہ تو پرامن آباد کار تھے جو یہاں آباد ہو کر انسانیت پر احسان کر رہے تھے اور آج ان کے پڑپوتے وسط ایشیائی یہی احسان دہرانے کی فکر میں دبلے ہو رہے ہیں کہ گرم پانی کی بندرگاہیں آدمی کو انسانیت کی خدمت پر اکساتی ہیں۔

انہی خرافات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ہندوستان میں حکمران رہے ہیں اور یہ کہ ہم ان حکمرانوں کی اولاد ہیں۔P.Herdy نے اپنی کتاب برطانوی ہند کے مسلمان The Muslim of Brithish India میں لکھا ہے:

''گنگا جمنا دوآب میں مسلمانوں کی آبادی کی تعداد اور تقسیم ۔۔۔اس علاقے میں مسلمانوں کے اقتدار کے عرصے اور طاقت سے نسبت معکوس رکھتی ہے ۔۔۔دلی پر قبضے کے سات سو سال بعد۔۔۔مسلمان صرف ۱۳ فیصد تھے۔۔۔ مسلمانوں کی صرف حقیر اقلیت اپنے لیے یا اپنے آباء کیلئے ''حکمران قوم'' کے فرد ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔۔۔اس علاقے کے پڑھے لکھے لوگوں کے بیرونی آباء اور حکمرانی کے دعوے کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت کسانوں، دست کاروں اور درباروں کے خدمت گزاروں مثلاً سازندوں، بھانڈوں، عطر فروشوں اور طوائفوں پر مشتمل ہے۔۔۔راجپوت نسل کے کاشت کار مثلاً ملکانے، خانزادے اور لال خانے اور ماہر دستکار مثلاً جلاہے، کپڑا چھاپنے والے تعداد میں ان لوگوں سے بہت زیادہ ہیں جو اپنے آپ کو سید، پٹھان

مغل یا شیخ کہہ کر بیرونی نسل کا یا حکمرانی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔۔۔پنجاب میں ایسے بہروپ اور بھی کم ہیں ۱۸۸۱ کی مردم شماری کے مطابق ہزار میں سے صرف۔۔۔مسلمان باہر والے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

یہ رہی حکمران قوم کے دعوے کی حقیقت اور یہ بھی ایک سبب ہے تشخص کے بحران کا۔

یار لوگ حکمران کہلانے کے شوق میں اپنے آبا وٗ اجداد سے منکر ہو جاتے ہیں۔ہمارے یہاں کی ایک جماعت تو باقاعدہ بیرونی یا بدیسی نظریات اور دیسی اجداد کے خلاف جہاد کرتی رہتی ہیں۔یہ اور بات اس کے اپنے ممبران بھی اپنے باپ کا نام لیتے ہیں اپنے امیر کو اپنا باپ نہیں کہتے کہ ہر شخص کا اپنا باپ ہوتا ہے۔۔۔یا ہونا چاہیے۔اپنے باب کو باپ کہنا تنگ نظری ،صوبائی عصبیت یا شاوٗنزم نہیں ہے۔باپ سا نجھے ہونے سے تو رہے۔پنجابی باپ، دادا، پردادا اور لکڑ دادا رکھنے والا اپنے آپ کو پنجابی کیوں نہ کہے۔ایک سندھی سندھی کیوں نہ کہلائے اور ایک پشتون اپنے پشتون ہونے پر فخر کیوں نہ کرے؟ ایک بلوچ، بلوچ ہونے پر کیوں گردن تان کر نہ چلے؟ ہم جو اس خطہ زمین پاکستان میں رہتے ہیں ان لوگوں کو اپنے آبا وٗ اجداد کیوں نہ کہیں جو درحقیقت ہمارے آبا و اجداد ہیں، وہ جو لاکھوں سال اس دھرتی میں آباد رہے اور یہیں دفن ہوئے۔ہم بھی اس دھرتی سے اگے ہیں اور ہم سے میری مراد اس ملک کی ننانوے فیصد آبادی ہے۔ہم کسی طوس یا گیلان، دلی یا لکھنو ،حجاز یا شام میں پیدا نہیں ہوئے۔ہم عربوں یا ہندوستانیوں کا اپنا باپ کیوں بنائیں یا بتائیں۔

**یہ بھی ہمارا تشخص ہے!**

پہچان کا ایک منفی طریقہ یہ بھی ہے جس کی مثال یوں ہے کہ مشہور تاریخ دان

الاستخاری نے خوریا زبان کے بارے میں کہا لیس عبرانی والا سریانی والا فارسی یعنی یہ زبان نہ عبرانی ہے، نہ سریانی اور نہ فارسی، اسی طرز پر ہمارا تشخص یوں ہوگا۔

اس سلسلے میں پروفیسر احمد حسن دانی کا کہنا یہ ہے کہ یہ سوال ہی غلط ہے کہ ہمارا تعلق گنگا کی تہذیب سے ہے یا وسط ایشیائی تہذیب سے، ہماری اپنی تہذیب ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔

ہم پاکستانی ہیں مگر پاکستان ہے کیا۔لوگ خصوصاً نئی نسل کے نئے لوگ یہ جاننا چاہیں گے۔ دنیا میں ہر چیز زماں ومکاں کے حوالے سے ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ پاکستان کا جغرافیہ اس سلسلے میں پہلی چیز ہے جس پر ہمیں توجہ کرنی ہوگی۔ ہمارا جغرافیہ وہ کیوں ہے جو آج ہے۔اس سے مختلف کیوں نہیں؟ ہماری مشرقی سرحد لاہور سے سولہ میل پر کیوں رک جاتی ہے۔ دلی اس میں شامل کیوں نہیں کہ ہم بلا واسطہ ''دلی دربار دیکھو'' کا لطف اٹھاسکیں۔ وہیلر اس سلسلے میں یہ کہتا ہے!

''اس کی قدرتی سرحدیں ہیں۔جنوب مغرب میں بحیرہ عرب۔کوہ ہمالیہ اور بلوچستان کے پہاڑ شمال مغرب میں ہیں۔جنوب مشرق میں تھر یا صحرا،صرف مشرق میں ہمالیہ اور صحرا کے درمیان ایک دوسو میل کی زرخیز پٹی ہے جہاں بھارت کے میدان مغربی پاکستان کے ساتھ بغیر رکاوٹ کے ملتے ہیں صرف یہی حدیں متعین نہیں ہیں۔جغرافیائی معنی میں اور صرف یہیں آدمی اپنی تقدیر کا مالک ہے ورنہ مغربی پاکستان کو ایک مکمل وحدت کے روپ میں نہ صرف انسان نے بلکہ قدرت نے ڈھالا ہے۔اس کی ریڑھ کی ہڈی سندھ کا دریائی نظام ہے''

اپنا جغرافیہ جاننا بہت اہم ہے کہ کبرال کا کہنا یہ ہے کہ تم چاول کو ہنڈیا سے باہر نہیں پکا سکتے۔''

اس لیے ہم اپنے تمام دعویٰ ہائے حب الوطنی کے باوجود محبِّ وطن نہیں ہو سکتے جب تک ہمیں اس دھرتی سے اس زمین سے پیار نہ کریں شاہ ولی اللہ نے کہا تھا'' آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے محبت کرتا ہے'' اور جس چیز کو آپ جانتے نہیں اس سے محبت کیا معنی؟

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی کا یہ کہنا ہے برصغیر پاک وہند میں گنگا کی وادی اس کا قلب یا Heartland ہے اور باقی علاقے Rimland یا اردگرد کے علاقے اور ہارٹ لینڈ اور رم لینڈ کا تو ہمیشہ سے جھگڑا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ تقسیم طبعی اور جغرافیائی عمل ہے۔

''جہاں تھر ختم ہوتا ہے براعظمی تقسیم شروع ہو جاتی ہے جو مشتمل ہے دو موسمی نظاموں کی حدود پر اور مغربی پاکستان کے شمالاً جنوباً بہنے والے دریائی نظام کو بھارت کے غرباً شرقاً دریائی نظام سے جدا کرتی ہے،،

پروفیسر فاطمی کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ نئی دریافت نہیں ہے بلکہ ویدوں کی بعد کی مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔ وشنو پران میں بھارت کی حدود یوں بیان کی گئی ہیں۔

''وہ ملک جو سمندر کے شمال اور برفیلے پہاڑوں کے جنوب میں ہے بھارت کہلاتا ہے۔''

اور سیاسی جغرافیائی حدود کا بیان یوں ہے:

''بھارت کے مشرق میں کرانا یعنی جنگلی رہتے ہیں مغرب میں یوانا (یعنی باہر کے یونانی) مرکز میں رہتے ہیں۔ برہمن کشتری ویش اور شودر''

جغرافیے کے مطالعے سے جو چیز کھل کر سامنے آتی ہے وہ پاکستان کی قدرتی وحدت ہے کہ یہ دریائے سندھ کا طاس ہے۔ دریائی آمد ورفت قدیم زمانہ سے ہو رہی ہے۔ جب آبادی بھی زیادہ تر دریاؤں کے کنارے ہوتی تھی۔ اس طرح سبھی علاقائی زبانوں کا تانا بانا اس زبان سے بنا ہے جس کو ہم دریائے سندھ کی زبان کہہ سکتے ہیں اور جس کے

مختلف روپ ہیں۔جٹکی، سرائیکی، ملتانی، سندھی وغیرہ۔ یہ زبان شمال سے جنوب تک ایک ہزار میل میں بہت حد تک مشترک ہے۔ یہ خطہ زمین نیم صحرائی ہے۔نہروں کے بغیر کاشت کاری ممکن نہیں۔ بند ایک علاقے میں بندھ سکتے ہیں پانی کا استعمال دوسرے علاقے میں ہوتا ہے۔تعاون ہماری مجبوری ہے۔اجتماعی کام نہ ہوگا تو اجتماعی بگار لازمی ہوگی۔

سرحد کشمیر اور شمالی بلوچستان کی وادیاں پنجاب میں کھلتی ہیں۔جنوبی بلوچستان اور سندھ میں گہرا تعلق ہے۔ پنجاب اور سندھ کا رابطہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا دریائے سندھ، سڑکوں اور ریلوں کا جال ہے۔ایک علاقے کی معیشت کا انحصار دوسرے پر ہے۔غرض ایک مشترکہ تہذیب ایک مشترکہ علاقے میں پروان چڑھتی ہے۔مغرب سے بے شمار لوگ یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ دراوڑ، آریا، ایرانی، یونانی، ساکا، کشان، ہن، ترک، تاتار، مغل، درانی وغیرہ جن کی وجہ سے ذاتوں کا ایسا امتزاج ہوا ہے کہ شکلوں کا امتیاز مشکل ہے۔ آپ شکل دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ سندھی ہے یا پنجابی یا پشتون، ذاتوں کے نام بھی ملتے جلتے ہیں مثلاً وڑائچ، بھروچ، باجوہ، باجوات، جٹ، اور زط وغیرہ لوگوں کے لباس اور خوراک ملتے جلتے ہیں۔شمال مغرب کے تو درے سال بسال نئے لوگ لا کر شامل کرتے رہے ہیں کہ پندرھویں صدی سے قبل ساری دنیا کی تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ بے آباد علاقوں کے لوگ آباد علاقوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔خصوصاً وسط ایشیاء اور جزیرہ نمائے عرب کے لوگ، یہ ان کی اقتصادی مجبوری تھی اور تاریخی جبر بھی تھا ان کے پاس اس زمانہ کا بہترین جنگی ہتھیار گھوڑا بھی موجود تھا۔ پندرہویں صدی کے بعد جب انسان نے غیر آباد علاقوں کو آباد کرنا شروع کیا اور گھوڑے کا توڑ بھی بندوق کی شکل میں دریافت کر لیا تو ہمارے ملک پر حملہ آوروں کی یہ شمال مغربی بارش رکی۔اب یورپی قومیں سمندر کی راہ آ کر ہندوستان پر قابض ہونا شروع ہو گئیں جس کا انجام ۱۸۴۹ء میں ہوا جب انگریزوں نے اپنی بنگال آرمی

کی مدد سے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔اس فوج میں زیادہ تر لوربیئے شامل تھے۔حقیقت یہ ہے کہ پنجابیوں،سندھیوں یا پشتونوں نے انگریز کیلیئے ہندوستان کا کوئی علاقہ فتح نہیں کیا۔ہاں انگریز نے ہندوستان سے فوج بھرتی کرکے پاکستان کو فتح کیا تھا۔تاریخ کا بہاؤ انگریز کے حق میں تھا اس لیے وہ کامیاب ہوا وگرنہ اس علاقے میں انگریز کو شدید مزاحمت ہوئی۔یہ بھی ہمارا تشخص ہے اور تشخص کا بحران اس لیے ہے کہ ہماری تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ہم نے تو ہمیشہ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ہے وہ سندھ کا بانکا جرنیل ہوشو تھا جس نے کہا تھا مرویسوں مرویسوں سندھ نہ ڈیسوں۔ہماری روزی دلی دربار سے بندھی ہوئی نہ تھی اس لیے ہمیں شمال سے آنے والے شاہان اسلام کا انتظار نہیں رہا۔دلی کے سلطانوں کے خلاف بھی اس علاقے میں بغاوتیں ہوتی رہی ہیں۔بابر آیا تو بابا نانک نے کہا ''پاپ دی جنج لے کابلو دھایا جوری منگے دان دے لالو''اکبر نے فرید کی کھال کھچوائی تو اس کا بیٹا دلا بھٹی للکارا''میں ڈھاواں دلی دے کنگرے۔دیوان شکر وانگوں بھور''اورنگ زیب کا مقابلہ ہوا تو پنجاب میں کھوپڑیوں کے مینار بنے اور خوشحال خان خٹک نے کہا آؤ دیکھو اس زمانے میں میں ہی تو ہوں وہ اک جواں ہمت جس نے اورنگزیب کے دل کو زخم آلود و داغدار کیا۔

اورنگزیب کے دل کو زخم آلود و داغدار کرنے میں اس مسرت کی خاصے کی چیز وہ سندھی کہاوت ہے جو دلی کے تغلق بادشاہوں کے متعلق ہے۔جب انہوں نے سندھ پر حملہ کیا۔ایک تو مارا گیا دوسرا بھاگ گیا۔سندھیوں نے کہا!

برکت شیخ پٹھا　　　　اک مویا اک نٹھا

بلوچستان کے عوام کے بارے میں ایک عرب لکھاری نے لکھا تھا۔''جان الکثیر بھا جائعہ وان قلیل بھا عبوذ''کہ ان میں اکثر بھوکے تو ہیں غلام فطرت نہیں۔غرض ہندوستان پر حکمرانی کے قصے سنانے والوں میں ہم شامل نہیں۔ہم تو تب بھی لٹتے رہے۔مگر لڑتے

رہے ہیں۔ نادر شاہ نے حملہ کیا یا بقول وارث شاہ پنجاب فتور پائے تو اس کا مقابلہ کیا۔

آیا نادر ڈھے پئی چادر　　　بابل نیویں دھون کڑے

گلیاں سے لکھ رون کڑے

بابل کی نیچی گردن کا تصور کرنے کے لیے پنجابی ہونا ضروری نہیں۔ اس کے بعد احمد شاہ دُرانی عرف شاہ اسلام نے پنجاب کو بار بار لوٹا کہ بلھے شاہ نے کہا:

کھلا در حشر عذاب دا　　　براحال ہویا پنجاب دا

اور وارث شاہ نے کہا:

احمد شاہ وانگوں میرے مگر پے کے　　　لُٹ پُٹ چُک دا تال کیتا

اس کی لوٹ مار کی وجہ سے پنجابی میں یہ کہاوت مشہور ہوگئی کہ:

کھادا پیتالا ہے دا　　　باقی احمد شاہے دا

یعنی جو کچھ ہے کھا پی لو ورنہ احمد شاہ لوٹ کر لے جائے گا۔

یہ سب کیسا ہے؟ جو لٹتے ہیں وہ مقابلہ بھی کرتے ہیں اور جو محفوظ فاصلے پر دلی میں بیٹھے ہیں اُن کو مغرب سے اُٹھنے والا غبار بھی کسی شاہ اسلام کا لشکر معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے Bias کا جس کا ترجمہ میرے ذہن میں جانب داری ہے۔ دربار سے متعلق میراثیوں، بھانڈوں کرائے کے سپاہیوں اور طوائفوں کے کوٹھوں پر تہذیب سیکھنے والوں کا مفاد اور عوام کا مفاد ایک نہیں ہوسکتا اور تاریخ کے خالق تو عوام ہیں مگر ہمیں جو بکواس تاریخ کہہ کر پڑھائی جاتی ہے، وہ شہنشاہوں کے قصوں اور قصیدوں پر مشتمل ہے۔ جو چیز دلی میں بیٹھ کر شمالی علاقوں میں شورش و بے چینی نظر آتی ہے وہ پاکستانی عوام کی خود اختیاری کی جنگ تھی اسی کو انگریزی محاورے میں کہتے ہیں ۔آپ باڑ کے کس جانب ہیں؟ دوسری چیز perspective ہے ۔آپ کس بلندی سے جائزہ لیتے ہیں ۔آپ شاہی مسجد کے مینار پر

کھڑے ہیں یا جی حضوری باغ میں؟ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء لاہور، حیدرآباد، پشاور، کوئٹہ والوں کے لیئے آزادی کا دن ہے اور دلی والوں کے لیے بھارت ماتا کے ٹکڑے ہونے کا دن۔

یہی چیز پوری تاریخ میں نظر آتی ہے۔ان دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ بھی ہمارے ہاں تشخص کے بحران کا سبب ہے!

کچھ لوگ اس حد تک تو آتے ہیں کہ ہم بھارتی نہیں مگر وہ ہمیں بھارت کا عکس یا سایہ بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ ہیں دوقومی نظریے والے جو اُلفت نہ سہی کے مصداق ہمیں دلی سے نتھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہے تشخص کا بحران!

یہ صحیح ہے کہ بھارت اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ ملک ہیں مگر ایران اور افغانستان سے بھی علیحدہ ملک ہے۔مُلکی تقسیم کو خواہ مخواہ مذہبی تقسیم کا رنگ دیا جاتا ہے۔ ہندو پانی مسلم پانی نئی نسل کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ دسہرہ دیوالی کیا ہے اور دو قومی نظریے کی بدولت آپ واہگہ بارڈر کا جواز تو ڈھونڈ لیں گے اور نوشکی کی سرحدوں کا کیا جواز ہے؟ طورخم کے دونوں جانب مسلمان پٹھان اور نوشکی کی دونوں جانب مسلمان بلوچ رہتے ہیں۔

یادش بخیر! اس نظریے کے علاوہ اردو اسلام کو بھی ہمارا تشخص بتایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ بات ۷۱-۱۹۷۰ کے بعد کوئی سنجیدگی سے کہتا ہو، کہ ان تینوں کی وہ درگت بنائی گی ہے کہ خدا پناہ تشخص کے ضمن میں یہ نکات اب اس قابل نہیں کہ ان کو کسی علمی اور سنجیدہ بحث کا موضع بنایا جائے۔ بقول اسحٰق محمد!۔

قیام پاکستان کیلیئے یہ موزوں نعرہ تھا اور اب۔۔۔رات گئی بات گئی۔۔۔۔اردو کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ ہر زبان کا ایک استعمال ہوتا ہے، ایک ضرورت ہوتی ہے جس طرح پاکستان میں رہ کر امریکی اور برطانوی سامراج کی دلالی کیلیئے انگریزی زبان ضروری

ہے اور آکسفورڈ اور سینڈ ہرسٹ سے تعلق قابل فخر اس طرح دلی دربار سے منسلکہ لوگوں کیلئے اردو زبان ضروری تھی۔ پنجاب میں یہ زبان انگریزوں کی بنگالی آرمی کے ہمراہ وارد ہوئی اور حاکموں کی زبان ٹھہری۔ آج بھی چھوٹے افسروں اور ہوٹل کے بیروں سے بات کرنے کے کام آتی ہے۔ اس کو یہاں کے لوگوں کی مادری زبان بنانے کی کوشش عبث ہے کہ مادری زبان کا مطلب ماں بولی ہوتا ہے۔ قوم تو عوام پر مشتمل ہوتی ہے اور ہمارے عوام کی غالب اکثریت کسان ہے۔ کسان اپنی ماں بولی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتا۔ اپنی مادری زبان کا استعمال سنت رسول علیہ وسلم بھی ہے۔ ایک اور قسم کی زبان البتہ پاکستان میں پروان چڑھی ہے کہ جب بھی دو پاکستانی آپس ملتے ہیں تو ایک نئی طرح کی زبان کی تخلیق کرتے ہیں۔ مثلاً ٹرک ڈرائیوروں کی زبان، اس کو آپ چاہیں تو اردو کہہ لیں۔ اس زبان کا مزاج زیادہ عوامی ہے، درباری نہیں۔ یہ نئی اردو پاکستان میں رابطے کی زبان بن سکتی ہے اور بن رہی ہے۔ اس بارے میں اسحاق محمد نے کہا ہے!

> ''اردو کو پاکستان کے لوگوں کی مادری زبان بنانے کی کوشش سراسر جہالت ہے۔۔۔ یہ سالمیت (Integration) کی زبان بن سکتی ہے۔۔۔ اس کا تخیل لکھنو اور دلی کے خاص خاص محلوں سے اٹھتا ہے، ایران اور توران سے اس طرف کہیں (Land) نہیں کرتا۔ اس کے برعکس یہاں کی مقامی زبانوں کا ادبی اثاثہ اس دھرتی اور یہاں کے عوام کی محبت سے رچا بسا ہے۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی، سندھڑی، مہران اور یہاں کے محنت کشوں کی محبت میں سرشار ہے۔ یہی حال وارث شاہ، بلھے شاہ اور خواجہ فرید کا ہے خوشحال خان خٹک نے بھی کھٹکی کے پہاڑوں سے دیوانہ وار محبت کی ہے اور اس وطن کے گیت گائے ہیں۔ راوی، چناب اور مہران کا ذکر خود پاکستانی علاقے کے اردو

شعرائ بہت کم کرتے ہیں۔ نہ ان کے ہاں سرسوں پھولتی ہے نہ چڑیاں چہچاتی ہیں اور نہ پیلو کی محبت ہے۔ وہ گل وبیل سے نیچے ہی نہیں اترتے۔۔۔قوم کی نشاۃ ثانیہ عوام کے خمیر سے اٹھے گی اور اس خمیر میں انگریزی کا کوئی جزو شامل نہیں اردو کا البتہ ہے کیونکہ اردو اور یہاں کی مقامی زبانیں سب آپس میں بہنیں ہیں۔''

مجھے یقین ہے کہ جہاں اسی اردو کی بات کی گئی ہے جس کا ذکر اوپر میں نے کیا ہے۔ پاکستانی اور عوامی اردو۔

بات زبان کی شروع ہوئی ہے تو کچھ ذکر ثقافت کا ہوجائے۔ زبان لباس عمارات ادب وغیرہ ثقافتی مظاہرے کے پس منظر میں گہرے تاریخی اور سماجی عوامل ہوتے ہیں۔ ناخن بڑھانا بظاہر ایک بے ضرر سا شوق ہے مگر اس کی تہہ میں یہ اعلان ہے میں برتن نہیں دھوتی اور سوئمبر میں شرکت کے متمنی شہزادگان کیلئے یہ وارننگ کہ مشتری ہوشیار باش۔ بہت تنگ یا بہت کھلے کپڑے بھی یہی ظاہر کرنے کیلئے ہیں کہ ان کپڑوں کے پہننے والے کو کام نہیں کرنا پڑتا۔ خضر حیات اور ہوٹل کے بیرے کی ایک جیسی پگڑیاں بلا وجہ نہیں ہیں اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ سبھی قسم کے دلال ایک خاص قسم کی ٹوپی کیوں پہنتے ہیں۔ برقعے کا استعمال غریب طبقے کی طرف ترقی کا سمبل ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی بہت سے معانی پنہاں ہیں۔ اپنے سے برتر کے ساتھ انگیریزی، کمتر کے ساتھ اردو اور برابر والے کے ساتھ پنجابی بولی جاتی ہے! کبرال کہتا ہے۔

ایک قوم ثقافتی طور پر آزاد صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ۔۔۔وہ قوم خود اپنی ثقافت کو اونچا لے جانے والے رستوں پر واپس پلٹ آئے اور جان لے کہ قومی ثقافت کی پرورش خود اپنے ماحول کی زندہ حقیقتوں کے تحت اور طفیل ہوسکتی ہے اور غیر ملکی ثقافت کے

غلبے اور نقصان دہ اثرات سے انکاری قومی ثقافت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

یہ صلاحیت ہونی چاہیے۔۔۔کہ مثبت ثقافتی اقدار کا تحفظ کر سکے ایک ایسا سنگم بنا سکے جہاں یہ خودمختار دھارے سے مل کر ایک نئی سمت کا تعین کر سکیں۔۔۔ثقافت بھی ہمہ وقت پھیلتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔۔۔

ثقافت کو تاریخ کا پھل سمجھنا چاہیے۔۔۔ ہر ثقافت میں ہزار خوبیاں ہوتی ہیں۔ ہزار کمزوریاں، کچھ حسرتیں ہوتی ہیں۔ کچھ کامرانیاں، مثبت پہلو بھی ہوتے ہیں۔منفی پہلو بھی۔۔۔کچھ ترقی کے عناصر ہوتے ہیں۔ کچھ ٹھہراؤ اور تنزل کے۔۔۔ترقی کی بنیادیں تعمیر کرتے ہیں۔ثقافت کی منفی قدریں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ہم منفی پہلوؤں سے آنکھ نہیں چرا سکتے ان کی نشاندہی لازمی ہے تاکہ ان سے جان چھڑائی جا سکے۔لال قلعہ تو ہم اپنے ساتھ نہیں لا سکے اور بہ امر مجبوری بھارت کو الاٹ کر دیا ہے مگر کچھ لوگ ابھی تک اس پر جھنڈا لہرانے کو تیار رہتے ہیں۔ کچھ چیزیں ہم ساتھ لے آئے ہیں جن میں سے منفی چیزیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینی چاہئیں ان سے چمٹے رہنا بھی بحران کا سبب ہے!

مثلاً ہیجڑوں کا ناچ ہے جس کو ہم اسلامی ہند کا تحفہ سمجھ کر قبول کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں اردو شاعری کے قصیدوں کو گلے سے لگانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس صنف کو جس میں خط رخسار دوست یا عطار کے لونڈے کی باتیں ہیں یا ہندی بچہ ای پیں چہ حسن دھرے چھچھے کا ذکر ہے یعنی عاقل و بالغ شعرا اساتذہ کا نابالغ لڑکوں سے عشق رہے۔ ثقافت کے مثبت پہلو تو برقرار رہتے ہیں اور مختلف تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اسلام کی آمد سے پہلے بھی ان علاقوں میں بدھ مت کے زیر اثر احرام باندھنے اور سر منڈانے کا رواج تھا۔تسبیح اور اعتکاف، مدرسے اور حجرے موجود تھے۔ذات پات نہ تھی۔اس لیے ان علاقوں میں اسلام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان اور بنگلہ

دیش ہی وہ علاقے ہیں جہاں ہندوستان سے دیس بدر ہونے کے بعد بدھ مت ٹکا رہا۔ ان علاقوں پر بار بار کے بیرونی حملے بھی اس کی ایک وجہ ہیں کہ تلوار سے بڑی تو کوئی ذات نہیں ہوتی اس لیے برہمن کی ذات پات یہاں نہ چلتی تھی۔ اسی لیے برہمن کا دھرم ان علاقوں میں آنے سے بھرشٹ ہوتا تھا۔ آج کا پاکستان یا پاک ملک برہمن کی نظر میں ناپاک ملیچھ ملک تھا۔ جب داہر کے باپ نے جو برہمن تھا یہ ملک فتح کیا تو مقامی آبادی اس پر خوش نہ تھی۔ اسی لیے محمد بن قاسم کے حملے کے وقت اس کا ساتھ دیا۔ برہمن کے مقابلے میں بدھ مت کا اور بعد میں ملائیت کے مقابلے میں صوفی ازم کا اور پھر ۱۹۷۰ء میں سوشلزم کا مشترک نفسیاتی پس منظر بھی تشخص کے معاملے میں بہت اہم کام ہے۔ پاکستان کے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت کا اسی حقیرسی مسلمان اقلیت سے مقابلہ کریں جو دلی کے اردگرد کے علاقے میں سات سوسال کی مسلمان حکومت کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ:

> ''سماج کا اندرونی معاشی اور سماجی ارتقاہی دراصل تاریخی عمل کی روح ہے۔ یہ ارتقاہی یہ تعین کرتا ہے کہ کسی اور تہذیب کا کون سا رخ شامل ہوسکتا ہے۔ یا کس طرح کا اثر ڈال سکتا ہے۔ ایسے اندرونی ارتقاء کے بغیر کسی قسم کے ثقافتی اثرات کو جذب کرنا ممکن نہیں ہوتا۔''

(پیپلز آف پاکستان گنگوئسی، ص ۳۱)

کھدائیوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہڑپہ تہذیب کے دور میں یہاں سے مختلف نسلیں آباد تھیں جو بنیادی طور پر دراوڑ نسل سے متعلق تھیں۔ مختلف نسلوں کا بیک وقت ایک تہذیب کے دائرے میں رہنا اس علاقے کی ایک صفت معلوم ہوتی ہے۔ آریاؤں کے آنے اور چلے جانے کے بعد گندھارا تہذیب کے دور میں جو مختلف نسلی گروہ یہاں آباد تھے

وہ بنیادی طور پر وہی تھے جو ہڑپہ تہذیب کے دور میں۔ یہ نسلی، رنگارنگی، بنیادی وحدت کے ساتھ آج بھی برقرار ہے۔

سائنسی مطالعے کا ایک بنیادی طریقہ یہ ہے کہ موضوع پر بحث کا صحیح تعین کرتے ہیں اس کو Defination یا تعریف کہتے ہیں۔قوم کی بہترین تعریف میری نظر میں سٹالن نے کی ہے۔ترمیم پسند سوشلسٹوں سے معذرت کے ساتھ سٹالن کہتا ہے۔

''قوم انسانوں کے ایسے پائیدار مضبوط گروہ کا نام ہے جس کے ارتقاو عروج میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو اور جس کے اندر (الف) اشتراک زبان (ب) اشتراک ارض (ج) اشتراک معاش (د) مشترک نفسیاتی ساخت ہو جس کا اظہار تہذیبی اتحاد و اشتراک میں ہوتا ہے۔''

اس نے اجزاء کیلئے اجزائے لاینفک کا لفظ استعمال کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں نے جو معروضات پیش کی ہیں ان کی رو سے ہم ایک قوم کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔اشتراک ارض کی شرط ۱۹۷۱ میں پوری ہوگئی ہے۔ویسے بھی چوہدری رحمت علی کے تصور میں جو پاکستان تھا اس میں بنگال شامل نہ تھا۔ایران اور افغانستان البتہ شامل تھے۔ علامہ اقبال نے بھی انہی علاقوں پر مشتمل پاکستان کا مطالبہ کیا تھا جو آج ہمارے ملک میں شامل ہیں (عمالستان وغیرہ کا ذکر خیر نہ تھا) قرارداد پاکستان میں بھی ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ریاستوں کا مطالبہ تھا جو ۱۹۷۱ میں پورا ہوگیا۔اب ہم پاکستان کا تشخص ماہ وسال کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

## آج سے ۵ لاکھ سال قبل مسیح

پوٹھوہار کے علاقے میں، ضلع راول پنڈی میں، سوان وادی میں اور دریائے جہلم اور دریائے چناب کے کنارے انسان کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں۔جدید پتھر کے

زمانے میں سائنس دانوں کے کہنے کے مطابق مقامی قسم کی انسانی تہذیبوں کا ظہور ہوا اور گنگوفسکی کا کہنا ہے کہ اس زمانے کے جو آثار پنجاب میں ملے وہ باقی ہندوستان سے مختلف ہیں۔

## ۲۰۰۰ سال قبل مسیح

برصغیر کے پتھر کے زمانے کو معراج کہا جا سکتا ہے۔ وہ خطے جہاں قدرت مہربان تھی۔ وہاں کاشت شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں نے برتن بنانے شروع کر دیے تھے اور بھیڑیں، بکریاں اور کتے پالنے شروع کر دیے تھے۔ اس کو منقش ظروف سازی کی تہذیب بھی کہتے ہیں اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں یعنی آج کے پاکستان میں یہ تہذیب پورے عروج پر تھی۔ گنوفسکی کے کہنے کے مطابق یہ سارا علاقہ ایک تہذیبی اور تاریخی وعدت تھا۔ کوٹ ڈیجی میں اس تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ اس زمانے میں وادیوں میں کاشت ہوتی تھی۔ پتھر کے بنے ہوئے بند بھی ملے ہیں۔ کاشت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی یہاں تک فاضل پیداوار ہونے لگی جس نے شہریوں کے قیام کو ممکن بنایا۔ اس علاقے میں کوئٹہ، امری نال اور کلو کی چھوٹی چھوٹی تہذیبیں وجود میں آئیں جن کے ماحول میں ایک وسیع تر تہذیب پروان چڑھی۔

## ۲۵۰۰ سے ۱۵۰۰ ق م

ہڑپہ تہذیب، شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً ۱۱۰۰ کلومیٹر، دجلہ و فرات اور نیل کی تہذیبوں سے زیادہ وسیع۔ باقاعدہ نقشے کے مطابق بنے ہوئے دنیا کے پہلے شہر، پورے علاقے میں ایک سی تہذیب ایک حکومت اور اس کی باقیات تقریباً سارے کے سارے آج کے پاکستان کے علاقے میں ملے ہیں۔ یہ ہے پاکستاج آج سے ۵۰۰۰ سال پہلے اس علاقے کا نام سپت سندھو ہے یا سات دریاؤں کی سرزمین، رزق کی فراوانی، اتھروید میں

لکھا ہے ''سلام اس دھرتی کو جہاں غلہ، چاول اور جو میسر ہیں جہاں پانچ قومیں آباد ہیں'' یہ وہ دن ہیں جب دنیا میں پہلی بار اس علاقے میں سوتی کپڑا بنا گیا جس نے سندھو نام پایا۔ موہنجوداڑہ کی آبادی ایک لاکھ تھی۔ یہ سندھو کا شہر جہاں کہنیوں تک کپڑے پہنے، ماتھے پر تلک لگانے، گلے میں سیاہ پہنے، کندن کے رنگ والی سہاگنیں شیو در کا دیپ لکشمی اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتارتیں۔

## ۱۵۰۰ ق م

''سندھو کے کنارے بسے ہوئے شہروں پر اللہ کا قہر ٹوٹا'' آریاؤں کا حملہ شروع ہو گیا۔ علاقہ تو آریاؤں نے فتح کر لیا مگر ہڑپہ کی برتر تہذیب نے آریاؤں کو فتح کر لیا۔ ۵۰۰ ق م تک یہ حملے جاری رہے مقابلہ بھی ہوا اور اس قدر رہوا کہ کہ آریا، گنگا جمنا کی وادی کی طرف جانے لگے اور وہاں جا کر اپنا ذات پات کا نظام بنایا۔ ہمارے علاقے نے یہ نظام نہ اپنایا۔ اس لیے یہ علاقہ بعد میں بھرشٹ قرار پایا۔ ہندوؤں کا کوئی تیرتھ اس علاقے میں نہیں ہے حالانکہ یہیں پہلا وید جو دنیا کی پہلی مذہبی کتاب ہے لکھا گیا۔ یہیں دنیا کا پہلا
گرامیریں پانی ہوا۔ آریائی آ کر چلے گئے مگر علاقے کی تہذیبی بنیادیں برقرار ہیں۔ زبان بھی بنیادی طور وہی اور نسلی گروہ بھی وہی ویدوں میں ۱۰۰۰ ق م سے ۵۰۰ ق م کے زمانے میں اس علاقے میں غیر آریائی قبیلوں کے وجود کے شواہد ملے ہیں۔ مثلاً دوآبہ رچنا میں مدار قبیلہ۔

## ۵۰۰ ق م

شمال مغربی پراکرت یا گندھارا زبان بولنے والے قبیلوں اور قومیتوں کا ایک گروہ ہندوستان کے شمال مغرب یعنی پاکستان میں وجود آ رہا تھا۔ مدھیا دیشی میں ایک علیحدہ زبان وجود میں آ رہی تھی۔ جو شمال مشرقی علاقوں کے درمیان حد فاضل کی طرح ہے۔ یہ ہے تشخص

پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش کا۔ یہ علاقہ ایران کی کیانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اس سلطنت کے ہندوستانی صوبے کے بارے میں جو تحریریں ملی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صوبہ آج کے پاکستان پر محیط تھا۔ اسانتری اسے سندھا کہتے تھے۔

## ۴۰۰ ق م

پاکستان نے کیانی سلطنت سے آزادی حاصل کر لی۔ بیرونی اثر مقامی تہذیب کو ختم نہ کر سکا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسی ماحول میں پانِنی نے دنیا کی پہلی گرامر لکھی اور اس علاقے میں پہلی یونیورسٹی پروان چڑھی۔

## ۳۲۶ ق م

سکندر یونانی حملہ۔ اس نے اس کو علیحدہ ملک تصور کیا۔ شمال مغرب میں سوات سے داخل ہوا اور اس کی مشرقی سرحد یعنی بیاس تک گیا پھر ملتان کے رستے کراچی کے قریب تک گیا اور بلوچستان کے رستے واپس چلا گیا۔ بقول وہیلر ''یہ تھا پاکستان سکندر کے دنوں کا اور یہی ہے پاکستان آج کا'' سکندر کے جانے بعد کچھ عرصہ بعد ہی چندر گپت موریہ نے یونانیوں کا اقتدار ختم کر دیا۔ چندر گپت راول پنڈی کا رہنے والا تھا مگر حکومت کا مرکز بھارت میں لے گیا۔ ۲۷۳ سے ۲۳۶ ق م تک اشوک کا دور آیا جس نے بدھ مت قبول کر لیا اور یہ بدھ دور تھا جس کا مرکز یہی علاقہ تھا۔ اشوک کے مرنے بعد یہ علاقہ آزاد ہو گیا۔ تیسری صدی ق۔م کے اختتام پر اس علاقے میں ایک آزاد حاکم سبھا گ سین کی حکومت تھی اور اس کا دارالحکومت گندھارا تھا۔

## ۱۰۰ تا ۵۰۰ عیسوی

ساکا اور کشان حکومت قائم ہوئی۔ یہ آزاد علاقہ ہندوستان کے ماتحت نہ تھا بلکہ

اس کے برعکس بہت سے علاقوں پر اس کی حکومت تھی۔حکومت کا مرکز پرش پورہ یا پشاور تھا جے سوال کی تاریخ میں ہند لکھا ہے ''پھر ملیچھوں کی حکومت آئی جو کشانوں کی حکومت تھی۔ سندھ کے کنارے'' یہ گندھار تہذیب کا دور ہے۔

**۵۰۰ تا ۶۰۰ء**

پشاور ہند میں شامل نہ تھا ہندوستان کی گر مارا اپرتی ہارا سلطنت کا حصہ نہ تھا۔نہ ہی گپت کی اور نہ ہی ہرش کی حکومت کا حصہ تھا۔چندر گپت کی حکومت جو اشوک کے بعد سب سے بڑی تھی، میں کشمیر شامل نہ تھا، ہ ستلج کے پار اس نے جانے کی کوشش کی۔''

**۷۱۲ سے ۱۰۱۰ء**

پہلے امیہ سلطنت کا حصہ رہا پھر عباسی سلطنت کا۔پھر آزاد یہ بالکل علیحدہ ملک تھا۔سکندر کی طرح محمد بن قاسم اور اس کے جرنیلوں کی فتوحات بھی پاکستان تک محدود تھیں۔ بقول عبداللہ یوسف علی ''دریائے سندھ کے دہانے سے کشمیر تک''بعد میں عرب راج۔ سندھ، بلوچستان، بہاولپور تک محدود ہو گیا۔شمالی پنجاب اور سرحد آزاد راجاؤں کے تحت تھے۔بھارت کے ماتحت نہ تھے۔''دویا کی قدیم ہندوستان کی تاریخ''میں لکھا ہے!

> ''عرب لکھاریوں کے نزدیک ہندوستان ہمیشہ ہند اور سندھ میں تقسیم رہا ہے۔سندھ جہاں محمڈنوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی۔ہندوستان سے علیحدہ ہے۔''

البیرونی نے لکھا ہے:

> ''اگر ہند جانا ہو تو براستہ کابل جائیں اور سندھ جانا ہو تو براستہ سجستان''

وہ لاہور کو ہندوستان کی شمالی حد، کہتا ہے۔کراچی کی بندرگاہ کو ابن بطوطہ نے لاہورانی لکھا ہے۔جو پنجاب اور سندھ کی بندرگاہ ہے۔محمد علی کوفی نے تاریخ ہند و سندھ

لکھی۔البیرونی بحیرہ عرب کوسندھ ساگر کہتا ہے۔

**۱۰۱۰ تا ۱۱۸۷ء**

کوغزنوی دور کہہ سکتے ہیں۔سلطنت کا مرکز غزنی تھا۔

**۱۲۱۰ء**

قطب الدین کی موت۔ پاکستان نصیرالدین قباچہ کے تحت بیس سال سے زیادہ آزادرہا۔حکومت کا مرکز بہاولپور اُچ تھا۔

**۱۷۲۱ تا ۱۹۴۷ء**

مسلمان اور برطانوی سلطنت کا حصہ۔جس میں جنوبی ایشیا کے بہت سے ملک شامل تھے۔اس دوران پاکستان کے بہت سے حصے بار بار آزاد ہوتے رہے۔انیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ علاقے آزاد تھے۔بدقسمتی سے ہماری محکومی کی صدیاں ہی وہ تاریخی دور ہے جس میں دنیا کی قوموں کی جدید سیاسی معنی میں تشکیل ہوئی ،مگر ہم اس عمل سے نہ گزر سکے۔کبرال کہتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام میں محکوم عوام کی تاریخی نشوونما ملیامیٹ ہو جاتی ہے اور یہ ہمارے تشخص کے بحران کا سب سے بڑا سبب ہے مندرجہ بالامعروضات کی روشنی میں پاکستان کے قومی تشخص کے بحران کا یہ حل ہے کہ ہم اشراک ارض کے عنصر کو دھیان میں رکھیں۔اپنی دھرتی کو جانیں ،پہچانیں،خلاؤں سے اوپر اپنے پیر جمائیں،اس سے پیار کریں یا ئے نسبتی کو چھوڑ کر دھرتی کے باسی بننے کی کوشش کریں۔

اشتراک زبان کو ذہن میں رکھیں اور علاقائی زبانوں کے ملاپ سے بننے والی زبان کو فروغ دیں اور انگریزی وغیرہ سے جان چھڑائیں۔اشتراک معاش کو ذہن میں رکھیں اور اپنی قومی معیشت کی تعمیر کریں جو سبھی افراد قوم کو باعزت روزگار مہیا کر سکے اور ہمیں

ساری دنیا سے بھیک مانگنے کے عذاب سے بچا سکے اور یہ کہ ہم مشترک نفسیاتی ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک قومی عوامی جمہوری اور سائنسی ثقافت کی تلاش۔

جو قومی ہو یعنی سامراج دشمن ہو

جو جمہوری ہو یعنی جاگیردار دشمن ہو

جو عوامی ہو یعنی سرمایہ دار دشمن ہو

اس ثقافت کی ترویج کی جائے اور اس کو ترقی دی جائے۔ پاکستانی قوم کی اس نئی ثقافت کی ترویج و ترقی ہمارا مقدس فریضہ بھی ہے اور تاریخی جبر بھی ہے۔ ہماری بقا کا جواز بھی ہے اور ہمارے جملہ مسائل کا حل بھی ہے۔

# نیا پاکستان

(یہ مضمون ۱۹۷۲ء میں لکھا گیا اور اس سے پہلے
مشرقی پاکستان کا المیہ نامی کتاب میں چھپ چکا ہے۔)

مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) دریائے سندھ اور اس کے ساتھیوں کی دین ہے۔ یہ نیم صحرائی علاقہ مصنوعی آبپاشی کے سہارے آباد ہے۔ لاکھوں سالوں سے یہ دریا آمدورفت کا ذریعہ رہے ہیں۔ انگریزوں کے آنے کے بعد سے یہاں ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے، پختہ سڑکوں کا وسیع سلسلہ ہے اور ہوائی جہاز بھی اب آمدورفت کا ذریعہ ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے بہت کم واسطہ تھا یہاں کا کوئی مسافر شاذونادر ہی کلکتہ سے پرے کا ریل ٹکٹ لیتا تھا اور کراچی سے شاید ہی کوئی تجارتی جہاز براہ راست چٹا گانگ روانہ ہوتا تھا حتی کہ ہوائی سروس بھی پاکستان بننے کے بعد شروع ہوئی۔

ثقافتی لحاظ سے بھی مغربی پاکستان کے علاقے ایک دوسرے کے بہت قریب

ہیں۔ یہاں کے لوگ گندم خور ہیں شکل و شباہت میں بھی ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں۔ان کی زبانوں کے رسم الخط عربی رسم الخط کی ملتی جلتی شکلیں ہیں اردو یہاں کی قدرتی رابطے کی زبان ہے۔ جہاں کہیں بھی یہاں کے مختلف علاقوں کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اردو کی کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔اس کے برعکس مشرقی پاکستان کے لوگ چاول کھاتے ہیں شکل وشباہت میں مختلف ہیں۔ بنگالی دیوناگری سے ملتے جلتے رسم الخط میں لکھی جاتی اور بائیں سے دائیں کو پڑھی جاتی ہے۔ یہ مزاحیہ فقرہ عام کسا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی ثقافتوں کا ایک دوسرے سے اتنا ہی واسطہ ہے جتنا ایک بھینسے کو ایک اونٹ سے ہوسکتا ہے۔

مغربی پاکستان زمانہ قدیم سے برصغیر ہند میں باہر سے آنے والے لوگوں کا دروازہ بنا رہا ہے مغرب سے بے شمار لوگ مختلف وقتوں میں برصغیر میں داخل ہوئے۔ دراوڑ، آریہ، ایرانی، یونانی، سیتھین، ترک، تاتار، مغل، دُرانی وغیرہ لوگوں کا ہزاروں سالوں سے تانتا لگا رہا ہے اور برصغیر کی اکثر آبادی انہی علاقوں سے ہوکر گزری ہے۔جنوب سے شمال کی طرف مشہور درے نو ہیں (1) سب سے جنوب میں مکران کا راستہ ہے جہاں سے سکندر یونانی کی فوج واپس گئی اور بعد میں عرب تاجر اور حملہ آور اسی راستے سے سندھ میں داخل ہوئے۔ (2) درہ ملا اس میں سے سکندر یونانی کچھ فوج لے کر خود گزرا یہ تجارت کیلئے زمانہ قدیم سے استعمال ہوتا آیا ہے۔ (3) درہ بولان کرتھار اور سلیمان سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان واقع ہے یہ بلوچستان کو شمالی سندھ سے ملاتا ہے۔ (4) درہ سخی سرور یہ کوہ سلیمان کا درہ ہے یہ جنوبی افغانستان اور شمالی بلوچستان کو ملتان سے ملاتا ہے قندھار کے راستے ایران کو بھی یہیں سے آمد و رفت ہوتی رہی ہے۔ نادر شاہ دلی کو لوٹ کر اسی راستے واپس ایران گیا (5) درہ گومل افغانستان اور برصغیر کے درمیان غالباً سب سے پرانا راستہ ہے اور ڈیرہ جات

کے راستے ملتان آنکلتا ہے۔(6) کرم اور ٹوچی کے درے یہ غزنی کو پنجاب سے ملاتے ہیں اور اسی راستے سے محمود غزنوی نے سندھ اور ملتان پر حملے کیے۔(7) درہ خیبر شمال مغرب سے برصغیر میں داخل ہونے کا سب سے بڑا دروازہ ہے (8) سوات اور چترال کے درے یہ ترکستان کو سوات باجوڑ اور چترال کی وادیوں سے ملاتے ہیں۔(9) گلگت کا درہ آج کل شاہراہ ریشم بن گیا ہے اور چین اور پاکستان میں آمدورفت کا بڑا اہم ذریعہ بننے والا ہے۔

صوبہ سرحد، کشمیر اور شمالی بلوچستان کی وادیاں اکثر پنجاب میں آ کر کھلتی ہیں اور ادھر ہی کو زیادہ تر آمدورفت اور تجارت کا رخ ہے۔اسی طرح جنوبی بلوچستان اور سندھ میں گہرا رابطہ ہے۔اسی طرح پنجاب اور سندھ کا قدیمی رابطہ اتنا ہی پرانا جتنا دریائے سندھ پرانا ہے۔ضلع ساہیوال میں ہڑپہ، ضلع لاڑکانہ میں موئن جوداڑو، ضلع نواب شاہ میں چہنوداڑو، ضلع لدھیانہ میں روپڑ، کوٹ ڈیجی ضلع خیر پور، شاہی ٹمپ ضلع مکران، ژوب، کوئٹہ، ڈیرہ اسماعیل خاں وغیرہ کے مقامات پر جو پرانے کھنڈروں کی کھدائیاں ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش مسیح سے کئی ہزار سال پہلے یہاں ایک ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی جو علمی حلقوں میں ہڑپہ تہذیب کہلاتی ہے، جس کے اس زمانے کی سمیری تہذیب کے ساتھ گہرے مراسم تھے اور جو ترقی کے لحاظ سے اس تہذیب سے کسی طور کم نہ تھی۔سو مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کا آپس کا قریبی رابطہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہزاروں لاکھوں سالوں سے چلا آ رہا ہے۔

وادئی سندھ یعنی مغربی پاکستان کے بنیادی اتحاد پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں تا کہ آپ ان ہیبت ناک طبقاتی، جغرافیائی اور تاریخی معاملات کا دل جمعی سے خوف کے بغیر مطالعہ کر سکیں، آج پاکستان جن کی زد میں ہے۔جغرافیائی لحاظ سے آج پاکستان جس پوزیشن میں ہے دنیا کا کوئی اور ملک نہیں ہے۔اس کے تین طرف دنیا کے سب سے

زیادہ آبادی والے ملک ہیں جن میں سے چین اور روس دنیا کی بڑی طاقتیں کہلاتی ہیں اور بھارت سے پاکستان حال ہی میں شکست کھا چکا ہے اور تینوں ملکوں کی آپس میں بڑے زور کی کھینچا تانی جاری ہے اور پاکستان اس کھینچا تانی کے بیچوں بیچ پڑا ہے۔ پاکستان کے چوتھی طرف عالم اسلام کا سلسلہ ہے جو بحر اقیانوس پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ عالم اسلام آج ایک بہت بڑے تغیر ایک بہت بڑی تقسیم و تفریق اور بڑے پیمانے پر تنظیم نو کے تقاضوں سے دو چار ہے عالم اسلام کی ان تبدیلیوں کا پاکستان کے حالات پر بڑا گہرا اثر پڑنا لازمی ہے۔

تاریخی طور پر سرزمین پاکستان نہایت قدیم زمانے سے آباد ہے اور یہاں ایک وسیع تر مشترکہ تہذیب کے بیچوں بیچ مختلف زبانیں اور تہذیبیں پروان چڑھی ہیں۔ اس کے چار واضح تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے منفرد حصے ہیں جن میں زیادہ تر پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی بطور مادری زبان کے بولی جاتی ہیں۔ اسکے علاوہ اردو کے بولنے والے ہر علاقے میں موجود ہیں۔ گجراتی، راجستھانی، بروہی، چترالی، کوہستانی، کشمیری وغیرہ ملا کر ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹوں کے مطابق پاکستان میں ۲۴ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مغربی پاکستان کی مختلف زبانوں کا تناسب آبادی کے لحاظ سے اس طرح ہے۔

(۱۹۶۱ء کی شماریات کے مطابق)

پنجابی (۳۹۔۲۲%) پشتو (۴۷۔۸%) سندھ (۵۹۔۱۲%)

بلوچی (۴۹۔۲%) فی صد اردو بولنے والے مہاجر (۵۸۔۷%) بروہی (۹۳۔۰%)

مختلف مادری زبانوں والی یہ قومیتیں ایک صوبے یا پاکستان تک محدود نہیں ہیں۔ بلوچستان کی ریاست لسبیلہ اور ضلع کچھی میں سندھیوں کی اکثریت ہے اور بھارت کے صوبہ گجرات میں بھی سندھیوں کی کافی آبادی ہے۔ بلوچ مشرقی ایران اور جنوبی افغانستان کے

بڑے علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح ان کی کافی بڑی تعداد سندھ اور پنجاب میں بھی ہے۔

بلوچستان میں چار لاکھ بلوچی بولنے والے ہیں جبکہ کراچی میں ایک لاکھ تیس ہزار ہیں اور باقی کے سندھ میں چار لاکھ بیس ہزار ہیں۔ ضلع ڈیرہ غازی میں اٹھارہ ہزار افراد کی مادری زبان بلوچی ہے۔ پشتون صوبہ سرحد کے علاوہ بلوچستان کے ضلع ژوب میں بہت بڑی اکثریت میں ہیں۔ بلوچستان کے کوئٹہ پشین اور لورالائی کے اضلاع میں یہ آبادی کا ۲۰ فیصد ہیں۔ پنجاب کے علاوہ ڈیرا سماعیل خاں اور ہزارہ میں پنجابیوں کی اکثریت ہے۔ کوئٹہ شہر اور لورالائی کے ضلع میں ان کی تعداد ۳۰ فیصد کے لگ بھگ ہے۔ مشرقی سرحد کے دوسری طرف بھارت اور کشمیر میں پنجابی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ تر جنوبی سندھ اور خاص کر کراچی میں ہے جہاں وہ ۱۹۲۱ء میں آبادی کا ۷۔۵۱ فیصد تھے ایک ایسا گھر جس میں اتنی منفرد طبیعتوں کے لوگ آباد ہوں اور جس کے اتنے دروازے ہوں وہ ڈنڈے کے ذریعے اکٹھا نہیں رہ سکتا۔ ایسے ملک کے استحکام کی ایک ہی گارنٹی ہے اور وہ عوامی جمہوریت اور سوشلزم ہے۔

سیاسی لحاظ سے مغربی پاکستان لگ بھگ ایک سو سال تک انگریزوں کی غلامی میں رہا۔ ۱۹۴۷ء کی نیم آزادی کے بعد ہی اب تک انگریز کا اثر فائق رہا ہے۔ البتہ ۱۹۵۲ء کے بعد امریکی سامراج کا پلڑا بھاری ہوتا گیا اور انگریز کی حیثیت گیدڑ سامراج کی سی بن گئی ہے۔ حالیہ سالوں میں دوسری بڑی عالمی طاقت سویت یونین بھی بحر ہند کے علاقے میں بڑے زوروں میں نمودار ہوگئی ہے اور یہ برصغیر اب امریکہ اور روس کی باہمی چپقلش کی زد میں آ گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے معاملے میں جس ڈھب سے سوویت یونین نے دخل

اندازی کی ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان دونوں بڑی طاقتوں کا دنیا کو آپس میں تقسیم کرنے کا معاملہ اس علاقے میں زیادہ سنگین ہو رہا ہے۔

امریکی پالیسی کا بڑا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول پاکستان میں امریکی اور دوسرے سامراجیوں کے سرمایے محفوظ ہوں اور یہ مغربی سامراجیوں کی عالمی منڈی کا حصہ رہے۔ دوئم، امریکی پاکستان کو مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کی حفاظت کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اس کا ایران کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنا چاہتے ہیں اور خلیج فارس کی عرب ریاستوں کا ناطہ پاکستان سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ روس کی پالیسی میں اول نمبر پر یہ بات آتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کو چین کے خلاف کر دیا جائے۔ بھارت، پاکستان، افغانستان اور ایران پر مشتمل ایک عسکری صف بندی کر دی جائے تا کہ چین کے ارد گرد گھیرا مضبوط اور موثر بنایا جا سکے۔ اس کے علاوہ روس کی یہ کوشش ہے کہ پاکستان کی ریلوے اور سڑکوں کو اپنی جنوبی ایشیا کے ساتھ تجارت کیلئے استعمال کر سکے اور پاکستان کو چین سے ملانے والی شاہراہ ریشم کو کسی نہ کسی طرح بیکار کر سکے۔

جب سے روس نے اپنے بین الاقوامی فرائض چھوڑ دیئے ہیں اور برتری کی تکمیل کیلئے کوشاں ہوا ہے اور اس نے پرولتاری انقلاب کی آبیاری کی بجائے کمزور اور پسماندہ ملکوں کی معیشتوں کو کنٹرول کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ اس کی اور امریکہ کی پالیسیوں میں زیادہ فرق نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی سامراجی پے درپے اپنی خارجہ پالیسی کی شکستوں کی وجہ سے اپنی خونخواری کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسے معقولیت کے پردے کے نیچے چھپانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس روسی جارحیت کا خواہ مخواہ مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور امریکہ کے بدنام وزیر خارجہ فاسٹر آپس کی طرح اپنی اخلاقی برتری کا

ڈھول بری طرح پیٹ رہے ہیں۔ دراصل امریکہ اور روس کے دوسرے ملکوں کے بارے میں رویہ میں زیادہ فرق نہیں رہا دونوں گماشتے سرمایہ داروں کی تلاش میں ہیں۔ دونوں پسماندہ ملکوں میں انقلابی ابھار کو بورژوا جمہوریت کی حدود سے آگے نہیں جانے دینا چاہتے۔ اور آج اندرا گاندھی ہو یا مسز بندر نائکے، مجیب الرحمٰن ہو یا ذوالفقار علی بھٹو یا ولی خاں سب امریکہ اور روس کے منظورِ نظر ہیں امریکہ اور روس آپس میں رقیبوں کی طرح لڑتے ہیں تا کہ ان بورژوا شاہدوں کو اپنے قابو میں کر سکیں۔ لیکن دونوں کا مفاد اس میں ہے کہ ان کے یہ چہیتے اپنے اپنے عوام سے محفوظ رہیں۔

پاکستان کے حکمران طبقے اور ان کے نظریہ گو اب تک مغربی سامراجیوں کے منظور نظر بننے کی فکر میں تھے لیکن آج ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اب یہاں ایسے بڑے سرمایہ دار، جاگیردار اور سرکاری افسر وافر تعداد میں نظر آ رہے ہیں جو روس اور اس کے آج کل کے حواری بھارت کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ بنگلہ دیش کا وجود میں آنا امریکہ کی نیند حرام نہیں کر رہا بلکہ یہ تو خود امریکی سازش کا بچہ ہے۔ امریکہ کو جو بات بہت ناگوار گزری وہ یہ ہے کہ وہاں روس اور بھارت کے حواریوں کا پلڑا بھاری ہونے سے امریکہ کے پالے پوسے ہوئے ایجنٹوں، البدر اور الشمس کے جلادوں کا قلع قمع ہو گیا ہے۔ امریکہ کو اب وہاں اپنے ایجنٹوں کی نئی فوج تیار کرنی ہوگی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سرمایہ دار جاگیردار اور مولوی لوگ امریکہ نواز اور روس نواز گروہوں میں بٹ رہے ہیں اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی طرح روس کی مداخلت نمایاں ہو رہی ہے۔

آج پاکستان میں ایک تیسرا ٹولہ بھی پر پرزے نکال رہا ہے یہ محنت کشوں کو ٹولہ

ہے۔ پچھلے چند سالوں میں محنت کشوں نے شعور کی نئی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ شعور ابھی پختہ نہیں لیکن پاکستان میں آج تاریخ کا دھارا اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے کہ اسی شعور کو پختہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ محنت کش آج خاک سے اپنے ماتھے اٹھا رہے ہیں اپنے گردونواح کا جائزہ لے رہے ہیں وہ اپنے حقیقی دشمنوں اور حقیقی دوستوں کو پہچاننے لگے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان میں نہ امریکہ نواز اور نہ روس نواز ٹولوں کا وجود رہے گا یہاں صرف ایک بڑا ٹولہ ہوگا جو پاکستان نواز ہوگا اور یہ پاکستان کے محنت کش ہوں گے جو" انٹرنیشنال" کی زبان میں اپنے سارے کام خود سنبھالیں گے۔

پچھلے سال مئی میں، میں نے ایک مقالہ بعنوان مشرقی پاکستان کا المیہ لکھا تھا اس کا آخری حصہ ہو بہو یہاں نقل کرتا ہوں۔

"موجودہ خانہ جنگی نے نہ صرف پاکستان کے شہریوں کے سروں پر مصیبت کے پہاڑ توڑے ہیں بلکہ قوم کو دنیا کی نظروں میں ذلیل کیا ہے وہ امریکی سامراجی جنہوں نے ناگاساکی اور ہیروشیما پر اٹیم بم گرا کر لاکھوں مردوں, عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو چشم زدن میں بھسم کر دیا تھا جنہوں نے ویت نام کے چھوٹے سے ملک پر اتنے بم برسا دیئے ہیں جتنے کہ دوسری عالمی جنگ میں بھی نہیں گرائے گئے تھے۔ اور جس نے وہاں پر لاکھوں مردوں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو شہید اور زخمی کیا ہے اور ملک میں ہر قسم کی تعمیرات، کھیتوں اور فصلوں کو برباد کیا ہے. وہ جرمنی جس نے دوسری عالمی جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کو اذیتیں دے کر مارا وہ برطانیہ جو تین سو سال سے انسانیت کے خون سے ہاتھ رنگ رہا ہے اور ۱۹۴۳ء میں تیس لاکھ بنگالیوں کو اپنے جان بوجھ کر پیدا کردہ قحط کا نشانہ بنا چکا ہے، وہ جاپان جو انسانیت کا قاتل بن کر چین اور جنوب مشرقی ایشیا میں بربادی پھیلاتا رہا ہے وہ

روس جو حال ہی میں چیکوسلاوکیہ کی آزادی کو ٹینکوں کے نیچے روند چکا ہے اور وہ بھارت جو آج بھی کشمیریوں، بنگالیوں، مدراسیوں، ناگا، میزو اور دوسری قومیتوں کو فوجی بوٹوں کے نیچے دبائے ہوئے ہے یہ سب آج پاکستان کو اخلاقیات کا سبق دے رہے ہیں۔ ان سارے گونگوں کو ایک بہرے کو سبق دینا بھی خوب ہے۔ قومیں اور افراد اگر اپنی غلطیوں کا ازالہ کریں اور آئندہ کیلئے سبق حاصل کرلیں تو ان کی نجات کی راہ نکل آتی ہے ہماری قوم کی موجودہ ٹریجڈی سے جو حقائق ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) جس معیشتی ڈھانچہ پر ملک اب تک چلتا رہا وہ عمل میں ناکارہ ثابت ہو چکا ہے جوں جوں وقت گزرے گا اس کے ناسوروں کی سرانڈ بڑھتی جائیگی اسکی سرانڈ کو ایوب خاں نے فوجی آمریت کے دبیز خول میں دفن کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوا اور بلاآخر ملک میں ایک خوفناک خانہ جنگی کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے حکمرانوں نے ابھی سبق حاصل نہیں کیا اور وہ اب بھی چاہتے ہیں کہ ملک کا نیم نوآبادیاتی نیم جاگیردارانہ معیشتی ڈھانچہ جوں کا توں قائم رہے جو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور افسر شاہی کی پرورش کرتا رہے جو سامراجی سرپرستی پر اور خیرات کا کشکول جس کا سہارا ہو اور قمار بازی اور سود خوری جس کے روح رواں ہوں۔

(ب) ملک میں قومیّتوں کے حق خود اختیاری کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی بنا پر یہ بھی حل نہیں ہوسکتا اس کا حل بھی یہی ہے کہ ملک میں مزدور کسان راج قائم ہو جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کے انخلاء سے وہاں قوم پرستی کی آگ ٹھنڈی پڑ جائیگی ان کو تاریخ اسلام سے سبق لینا چاہیے

کہ کس طرح آغاز اسلام میں ہی اقتدار کے مسئلہ نے بنوامیہ اور بنو ہاشم میں خوف ناک خونریزی کو جنم دیا پاکستان میں قومیّتوں کے مخصوص مفادات کا تحفظ نہ ہوا تو پاکستانی قوم کا پنپنا محال ہے۔

(ج) یہ بات تجربہ نے بار بار ثابت کی ہے کہ سامراجی اور سوشل سامراجی اب پاکستان کا وجود گوارا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں اور پاکستان کے وجود کا انحصار بہت حد تک عوامی جمہوریہ چین کی خیر سگالی پر ہے۔

(د) بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار حکمران طبقے اس ملک کی سلامتی، خوشحالی اور اتحاد کی ضمانت دینے سے عاری ہیں۔ یہ کام اب مزدوروں، کسانوں، انقلابی دانشوروں، متوسط طبقہ کے دوسرے محبّ وطن افراد اور ان کے جیالے بیٹے بیٹیوں کی ذمہ داری بن گیا ہے۔ اور وہی اس کو سرانجام دیں گے یہ ان کا تاریخی فریضہ ہے اور پاکستان کا یہ تاریخی مقدر ہے۔ عوامی جمہوریت کا روشن آفتاب ہی ان اندھیروں کو دور کرے گا جن میں آج قوم بھٹک رہی ہے اور جن کی وجہ سے ہمارے عوام ذلیل خوار ہیں۔

(ر) مشرقی پاکستان کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ حق خودارادیت کیلئے جدوجہد نسلی اور لسانی منافرت پر سرے نہیں چڑھ سکتی اسے اب محنت کشوں کو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لینا ہوگا۔ اور یہ صرف پاکستان بھر کے محنت کشوں کے طبقاتی خلوص اور یک جہتی کے طفیل بارآور ہوگی۔

(س) یہ درست ہے کہ پاکستان کی آفرینش میں برصغیر ہند میں مروج برہمنی ذات پات کو بڑا دخل تھا لیکن پاکستان کی بقا کا انحصار اس قسم کی انسانی تقسیم وافتراق پر نہیں ہوسکتا

کیونکہ آج کی روح عصر یعنی سوشلزم کیا پاکستان، کیا بھارت، کیا سیلون، کیا برما، کیا نیپال، اور کیا چین ہمسائے کے ان تمام ممالک بلکہ دنیا بھر کے عوام کے دلوں کو اپنی مقناطیسی کشش میں سموئے ہوئے ہیں اور ہر جگہ کے عوام ذات پات کے جھگڑے جھمیلے چھوڑ چھاڑ کر سوشلزم کی طرف لپک رہے ہیں پاکستان کی بقاء اب برہمنی ذات پات کے عکس یعنی دوقومی نظریہ پر ممکن نہیں ہے بلکہ اس کو سوشلزم کے عالمی دور کے تقاضوں کے مطابق ہی پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔

آج بھی معمولی ردوبدل کے بعد یہی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔